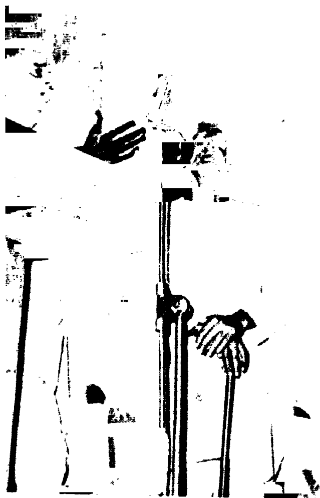
صبح

محمد عتیق صدیقی

انجمن ترقی اردو (ہند)
شاخ دہلی



ڈاکٹر بی گوپال ریڈی وزیر اطلاعات انجمن کے ایک جلسے کی صدارت فرماتے

صبح

پہلا حصہ

انجمن ترقی اردو ہند شاخ دہلی

مجلسِ مشاورت:

تلوک چند محروم — روشن صدیقی

صالحہ عابد حسین — حمیدہ سلطان

اڈیٹر:

محمد عتیق صدیقی

ظفر ادیب
پرنٹر پبلشر نے یونین پرنٹنگ پریس دہلی سے چھپوا کر
انجمن ترقی اردو (ہند)، شاخ دہلی، علی منزل کوچہ پنڈت سے
شائع کیا

ترتیب

قاضی عبدالودود

غالبؔ کے ایک قصیدے کا اولین ممدوح

(۱) غالب خاتمۂ گل رعنا میں جو کلکتہ کا لکھا ہوا ہے اور پنج آہنگ میں شامل ہے سفرِ کلکتہ کا ذکر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"نخستؑ اتفاقِ ورود بہ لکھنؤ افتاد۔ نظم

اندر آن بقعۂ معمور ز دلتنگی خویش — حسرت آگین چو گنہگار بزندان رفتم
جلوه در طالع خاشاک من افتاد زبون — شد غلط جادۂ گلشن بگلستان رفتم
تشنۂ بحرِ تماشا شدم صرفه نکرد — کہ زجوشش عرقِ شرم بطوفان رفتم
سبزۂ رنگ طراوت بخزان باختہ ام — خس شدم تا بچراگاه غزالان رفتم
کاهش میسوختم ز داد فنا میدادم — شرم بادا کہ بدان تازه خیابان رفتم

گفته رفته ذکر خاکساریهای مرا به بزم آغا میر.. کہ در آن روزها با هنگ معتمد الدولگی بلند آوازه بود و بر خانی فرمانروای آن کشور و مدار المهامی آن سلطنت اشتهار داشت رسانیدند، تا از آن جانب کشش رفت، ازین سو نیز آشوب هوسی گل کرد، چون ملازمت قرار یافت خواستم دستانۂ عقیدتی سرانجام دادن، وره آورد عالم مبجوری موضه داشتن طبع از فکر قصیده مشتی گرد، سینه برین آرزو تنگی، مجنون شوقم. میدانی کنار تاپیدای شرار افشانی، و سواد عبارتی هم در صنعت تعلیل روشن ساخت گرچه وقت اقتضای دیدن آن جا همه نکرد، و آن هوس باز سینه بدر رفت، اما آن مسوده در سفینه ماند۔"

فرمانروائی آں کشور سے مراد غازی الدین حیدر متوفی ۲۷ ربیع الاول

---

[1] کلیات نثر فارسی مطبوعہ ۱۸۶۸ء ص ۱۰

۱۲۳۳ھ میں۔ آغا میر اس کے وزیر تھے۔ غالب نے صراحتہً کہا ہے کہ میں اس کی مدح میں قصیدہ نہ کہہ سکا۔ اشعار منقولہ بالا ایک قصیدے کے ہیں جو کلیات نظم فارسی میں موجود ہے لیکن کلیات میں ترتیب اشعار وہ نہیں جو خاتمے میں ہے، اور اس میں ایک شعر بیتِ ۱۷ کے بعد ہے جو خاتمے سے غیر حاضر ہے۔ خاتمے میں جو اشعار ہیں وہ یا تو پہلے سے موجود تھے یا اس کی تحریر کے وقت موزوں ہوئے۔ گل رعنا کا ایک نسخہ مالک رام صاحب نے براہ کرم مجھے دکھایا تھا میں اس وقت یہ کہنے سے قاصر ہوں کہ اقتباس بالا اس میں بجنسہٖ اسی طور پر ہے یا اختلاف کے ساتھ ہے۔

(۴) غالب نے سبحان علی خاں کے نام ایک خط لکھا تھا جو پنج آہنگ میں موجود ہے اس کا اقتباس ذیل ملاحظہ ہو[1]

"فرخی طالع خویشتن را ستایم کہ درین جستجو خاطر جز بالتفات خان رفیع الشان (مکتوب الیہ) پیوند منت پذیری نگرفت غبار این آرزو بدامن دل آویختہ و شور این تمنا غوغای رستخیز لا نہاد برانگیختہ کہ این مو منداشت بفروغ نگاہ آصف ثانی (وزیر) مشرقستان گرمہ دیاز قصیدہ بیرنم مینو مثال سلیمانی (مراد از دربار شاہی) خواندہ شود تا مرا بجائزہ خسروی ارغ امتیاز افزونش پذیرد، و آنگاہ صلہ بدان گرانمائگی کہ ہم بدہرم بلند نامی دہد، وہم در نظر تحقیہ گرامی کند۔ خود بیسگالد کہ این آرزو ہای دشوار، چہ مایہ دور باش یاس در برابر است، اما ہم درین سگالش دل بدین اندیشہ نیز بمیپذیرد کہ خان ارسطو تدبیر (مکتوب الیہ) را ابر کجا فراوانست، دشاہ و وزیر را دست بخشش و ماز۔"

قصیدے سے یقین ہے کہ وہی قصیدہ مراد ہے جس کے کچھ اشعار اوپر نقل ہوئے ہیں۔ اس کے بعض دوسرے اشعار ملاحظہ ہوں:[2]

ہم ذاسمت کہ دہو نصرت دین حیدر	صفت ذات تو کاستم و تا زان رفتم
بزم دستور ترا قطعۂ گلشن گفتم	چون بیدم ہم از آن گلشن بشیان رفتم
روشن الدولہ بہادر کہ بایثار و عطا	حاتمش گفتم و شرمندۂ نقصان رفتم

[1] ایضاً ص ۳۰۱
[2] کلیات نظم فارسی طبع ۱۸۶۳ء ص ۲۱۱

بلبلم لب پر و نیو لیس براتم بروی تا بدانم کہ بآصف ز سلیمان رفتم

قصیدے کا اصلی ممدوح نصیر الدین حیدر ہے' اور ضمناً روشن الدولہ کی بھی تعریف ہے۔ واضح رہے کہ سبحان علی خاں بقول صاحب تاریخ اودھ "میر کونسل معتمد الدولہ" تھے۔ معتمد الدولہ کی معزولی کے بعد یہ میر فضل علی خاں کے معتمد علیہ بھی رہے' اور جب روشن الدولہ وزیر ہوئے تو حضرات کنبوہ (مراد از سبحان علی خاں وغیرہ) کا گھر مرور صحبت خاص و عام ہوا۔ روشن الدولہ ۱۲۴۳ھ میں اس عہدے پر فائز ہوئے تھے۔ اسی سنہ میں یا اس کے کچھ بعد غالب نے قصیدۂ زیر بحث سبحان علی خاں کے پاس بھیجا ہوگا۔

(۳) غالب نے کرم حسین خاں سفیر شاہ اودھ کو ایک خط لکھا تھا جس میں یہ عبارتیں ملتی ہیں:

انجمن شوق در صلۂ نگارش این قطعہ دستمزد خویش بیشتا سم روشناسی غرہ است' وتشریف قبول و نوید التفات و عطیۂ فتوح ۔ امکان ستایش طلسم این دعا درکرو آنست کہ پایہ و مقام ستایشگر بحضرت ممدوح برشمردہ شود تا باندازۂ ارزش وی عطا تواند کرد' ورنہ پیداست کہ جائزہ یاد خوانان تا چہ قدر راست' و آبروی مدح گستران تا بکجا۔ اندیشۂ فتویٰ مید ہد کہ پیدائی این مراتب بانداز گفتار سبحان علی خاں صاحب نباشد۔ ایشان آبروی خاک ریزهای سال نظر نمایند و حیثیت و صلہ جو نشمارند' اگر مخدوم مرا سر بکس نوازیست' قطعہ در نوید نعمات شاہی فرو بچیند' و آنچہ حال نامہ نگار در خورد اند بکما بیش رقم فرمایند تا ہم بنظر سلطان گذرانیدہ باشم و ہم ببرگ و نوا رسیدہ ۔۔ اگرچہ پایۂ فرمانروا اودھ بالاتر از آنست کہ چون منی لب بستایش تواند گشود' لیکن من ہم درین شیوہ کہ عبارت از ثنا خوانی و سخن وریست' تنگ دامان خویشم۔ بالجملہ سپاس ازبخت دارم کہ مرجع من' مولوی سید کرم حسین خاں بہادر بالاسد جد کرم نکند۔"

کلیات نظم فارسی میں صرف ایک قطعہ ایسا ہے جس کا شاہ اودھ سے تعلق ہے' اس کا عنوان "ستایش گستری پادشاہ اودھ" ہے۔ "پادشاہ اودھ" سے مراد نصیر الدین حیدر ہے۔ قطعے کے دو شعر حسب ذیل ہیں:

۱؎ کلیات نثر غالب صفحہ ۔ ۔ ۲۷

بہ ترتیب این ہمایوں جشن   کہ خسرو خجستہ باد بفال
زد رقم بزم عشرت پرویز   وینکہ گفتم بود زدی وصال

"بزم عشرت پرویز" = ۱۲۴۳ "زردی وصال" = ۲ شادی ۱۲۴۵ھ میں ہوئی تھی اور قطعہ اس پر مشعر ہے۔ خط میں سبحان علی خاں کا ذکر جس طور پر ہے، اس سے مترشح ہوتا ہے کہ غالب ان کے رویّے سے ناخوش ہیں۔

(۴) تفتہ نے ایک قصیدہ زیر بحث کی زمین میں لکھا تھا، غالب اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک خط میں تحریر کرتے ہیں۔

"میرا ماقصہ[1] تم نے یاد دلایا، داغ کہنۂ حسرت کو چمکایا۔ یہ قصیدہ منشی محمد حسن کی معرفت روشن الدولہ کے پاس اور روشن الدولہ کے توسط سے نصیر الدین حیدر کے پاس گذرا اور جس دن گذرا اسی دن ۵ ہزار روپے .. بھیجنے کا حکم ہوا۔ منشی محمد حسن نے مجھ کو اطلاع نہ دی۔ مظفر الدولہ لکھنؤ سے آئے انھوں نے یہ راز مجھ پر ظاہر کیا اور کہا خدا کے واسطے میرا نام نہ لکھنا۔ ناچار میں نے شیخ ناسخ کو لکھا۔ انھوں نے جواب لکھا کہ ۵ ہزار ملے۔ تین ہزار روشن الدولہ نے کھائے دو ہزار منشی محمد حسن کو دیے کہ اس میں سے . . . جانو غالب کو بھیج دو۔ کیا اس نے ہنوز تم کو کچھ نہ بھیجا ہے۔ میں نے لکھ بھیجا کہ مجھے پانچ روپے بھی نہیں ملے۔ انھوں نے لکھا کہ اب تم مجھے خط لکھو اس کا مضمون یہ ہو کہ میں نے بادشاہ کی تعریف میں قصیدہ بھیجا ہے۔ اس کا صلہ کیا مرحمت ہوا میں کہ ناسخ ہوں اپنے نام کا خط بادشاہ کو پڑھوا کر ان کا کھایا ہوا روپیہ ان کے حلق سے نکال کر تم کو بھیجوں گا۔ یہ خط .. میں نے .. روانہ کیا۔ آج .. روانہ ہوا۔ تیسرے دن .. خبر اڑی کہ نصیر الدین حیدر مر گیا۔ اب کہو میں کیا کروں اور ناسخ کیا کرے۔"

ظاہر ہے کہ اگر قصیدہ لکھنؤ گیا تھا، تو اس کا زمانہ وفات نصیر الدین حیدر ( ) سے بہت قبل نہ ہوگا۔ روشن الدولہ   سبحان علی خاں وغیرہ کی پاسداری کی وجہ سے معزول ہو چکے تھے اور وفات نصیر الدین حیدر کے وقت دوسرا شخص وزیر تھا۔ ناسخ کا رسوخ عہد معتمد الدولہ میں تھا، جو آغاز دور نصیر الدین حیدر میں ختم ہو گیا تھا۔ معتمد الدولہ کانپور چلے گئے

---

[1] اردوئے معلی مطبع کریمی لاہور صفحہ ۱۹۵ +

اور ناسخ مرقوں جلاوطن رہے۔ نصیر الدین حیدر کے زمانۂ آخر میں، وہ اس قابل نہ تھے کہ بادشاہ کو اپنے نام کا خط پڑھوا کر معزول شدہ وزیر کا لکھایا ہوا روپیہ وصول کر کے غالب کو بھجواتے۔

(۵) اقتباسات مکاتیب غالب بنام "منشی محمد حسن خاں" (الف) "پیش ازیں نامہ بنام سبحان علی خاں دو عرضداشتی بحضور.. وزارت پناہی با یک قصیدۂ مدحیۂ شاہ رقم کردہ مجموعۂ اوراق پیش وکیل راجہ.. صاحب رام.. فرستادہ ام وخواستہ ام کہ.. بنظر خان صاحب گذشتہ، بحضرت دستور اعظم رسد. بو کہ این قصیدہ ببزم خسروی خواندہ شود و نامہ نگار از مائدہ جود خسرو دادو (کذا) و نلہ بر بندد. تا امروز کہ ہمین کمال گذشت بیچگونہ۔ اثری پدیدار نگشت.. امروز کہ چہارشنبہ ہژدہم ماہ ترسایانست.. خیال درد دل این آشوب انگیخت کہ بہ راجہ صاحب رام، عرض کردہ شود کہ بہ یکشو وکیل خود را نویسند تا آن نامہ و آن عرضداشت کہ نورد آن بقصیدہ آبستن است، بوالا خدمت شما رساند ذوق آرزو طلبی آنچنان بیتابم کرد کہ.. بشب نامہ نگاشتم و ہم بشب بخدمت راجہ صاحب فرستادم. امید کہ چون وکیل راجہ صاحب این مراعت نامہ بالگاشتہ ہای کہ بر شمرد آمد بلا زمان دہید کرم بکوشش آید و تفقد صرف غالب نوازی گردد۔ این قدر میگویم کہ مرا پاسخ این نامہ باید نواخت" (کلیات ص۱۴۵)

(ب) مکتوب الیہ کو کوئی عہدہ ملا ہے۔ اس خط میں اس کی مبارکباد بھی ہے غالب کہ نوآموز شیوۂ گدائیست ہر چند بحکم حیا بخموشی ساخت، اکنون کہ جوشش گلبانگ تہنیت مہر سکوت نہ ہر برداشت.. آنچہ در دست از لب فرو میریزد۔ فرستادن قصیدۂ مدحیہ جامعہ (کذا) مدح شاہ و وزیر بسا گر انمایہ عزیمتہا راشامل است.. بو کہ مرا بجائزہ یاد خوانی.. این مایہ سال زان کہ یک خود را گرد آمدہ، بہ کلکتہ توانم برد و کاری توانم کرد.. اگر درین نزدیکی تقریب اندیشیدہ قصیدہ را بحضور کنا) و حال سائل گذاردہ شود موافق است ستر گی و بخشش است (کلیات ص۱۵۸)

ان اقتباسات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ غالب نے قصیدہ وغیرہ محمد حسن کے حوالے کرنے کی بجائے ابھی مگر یہ پتا نہیں ملتا کہ یہ چیزیں وکیل راجہ صاحب رام نے انھیں دیں یا نہیں۔ محمد حسن کی طرف سے ظاہرا ان کی رسید غالب کو نہیں بھیجی گئی۔ اس کا امکان بھی ہے کہ غالب کی ہدایت موصول ہونے سے پیشتر ہی قصیدہ وغیرہ سبحان علی خاں کو دیا گیا ہو۔

(۶) اقتباس مکتوب غالب بنام تاسخ۔ یہ اوائل ۱۲۵۱ھ کا خط ہے۔ اس میں شمس الدین احمد خاں کے مقدمے کا ذکر ہے "آنچہ درباب پاسخ مکتوب من بزبان گوہر فشان سبحان علی خاں رقم پذیر فتہ است، نہ چنانست بلکہ احق آنست کہ خان والا شان بکتابان نسپرونشدہ والتفات بخاکسار ان ننگ پایۂ خود شناخت ورنہ بشرط تامل بنہان نتواند ماند کہ مقصود من ہمہ آن بود کہ قطعہ بنظر بندگان خسرو سپہر آستان گذرد و لختی از خاکساری و بے اعتباری من گفتہ شود و اینہا خود ایں قدر دشوار نبود" کلیات ۳۳۴

اس خط کا تعلق قصیدہ و عرضداشت سے نہیں، اس قطعے سے ہے جس کا ذکر آچکا ہے۔ کرم حسین خاں کو سبحان علی خاں کے متعلق جو کچھ لکھ چکے تھے اس کے بعد ان سے کاربرآری کی کیوں امید تھی یہ سمجھ میں نہ آیا۔

(۷) کتبخانۂ خدابخش میں غالب کے کلیات نظم فارسی کے دو قلمی نسخے ہیں، اور یہ دونوں غالب کی نظر سے گزر چکے ہیں اور دونوں کی کتابت تیرھویں صدی کے چھٹے عشرہ میں ہوئی ہے (ان سے متعلق میرے مقالے شائع ہو چکے ہیں) قصیدہ زیربحث ان دونوں نسخوں میں ہے، اور اس کا عنوان دونوں میں یہ ہے:

"گرایش خیال بہ نکھنؤ لبسر و برگ ذریعۂ این قصیدہ و نگارش پذیرفتن مدح شاہ اودھ درجریدہ، و بورق یادگار ماندن مدح بممدوح نارسیدہ از عالم مستی بہوی بادۂ ناکشیدہ۔"

اس سے صاف ظاہر ہے کہ قصیدہ ممدوح یعنی شاہ اودھ تک پہنچا ہی نہیں، صلے کا کیا سوال ہے۔ یہ معاملہ کہ بادشاہ نے ۵ ہزار غالب کو دیے جانے کا حکم دیا تھا، عالم خیال میں پیش آیا تھا۔

(۸) امور بالا محض بطور تمہید ہیں۔ اس مقالے کی علت غائی یہ بتانا ہے کہ در اصل قصیدہ معتمد الدولہ کی مدح میں تھا۔ غالب نے یہ بات کہ قصیدہ نہ کہہ سکا، مصلحۃً لکھی تھی۔ فی الحال اس قصیدے کے ۱۰۴ اشعار ہیں ابتدا میں ۱۰ اسے معتمد الدولہ سے ملاقات نہ ہوئی اور یہ قصیدہ پیش نہ ہوا تو وہ اسے نواب مرشد آباد کے نام سے شہرت دینا چاہتے تھے لیکن یہ ارادہ قوت سے فعل میں نہ آسکا۔ غالب ایک غیر مطبوعہ خط میں محمد علی خاں (باندہ) کو لکھتے ہیں کہ ہیں بنے

معتمد الدولہ کی مدح میں جو قصیدہ کہا تھا وہ، جب تک کہ ترمیم نہ ہو، کسی کو دکھایا نہ جائے
خط کا اقتباس ذیل ملاحظہ ہو:

قصیدہ کہ در مدح آغا میر گفتہ ام خدا میداند کہ برائی خاندان من افزود داغ بدنامیست[1]
و علت اینکہ یک صد و دہ شعر را از صفحہ ملک ساختن نمیتوانم بجا نواب مرشد آباد نیز
سیدزادہ است این قصیدہ را بنام وی شہرت دہم گو بملاحظہ مشش نارسیدہ۔[2] لیکن
مادح بودن من بہایون جاہ (نواب مرشد آباد) را بر من ناگوار نیست توقع تازمانیکہ اشعار موضع
اسم ممدوح بیجے قصیدہ را کس نماید و عیب خسروان راچون بزرگان بپوشند"

میرے پیش نظر اصل خط نہیں، اس کی نقل ہے۔ اس کے مکتوب الیہ کا نام مرقوم نہیں لیکن
اس میں شک کی گنجائش نہیں کہ محمد علی خاں کے نام سے ہے۔ خط ڈیریکٹ جس مجموعے میں ہے اس کا مفصل
ذکر کسی دوسرے مقالے میں کیا جائے گا۔

نثار احمد فاروقی

غالب کی ایک "غیر مطبوعہ" رباعی

"مطبع محمدی محمد مرزا خاں واقع دہلی" سے ایک چھوٹا سا رسالہ "عیدی نامہ" طبع ہوا تھا، اس کے
صفحات کی تعداد ۳۵ ہے۔ آخر میں تاریخ طبع زادہ ہے چند التخلص بہ عاصی درج ہے، خاتمہ
میں "طبع محمدی محمد مرزا خاں واقع دہلی" کچھ چیدہ مدیحاوی لکھا ہوا ہے۔ اس مختصر رسالے میں بچوں
کے لئے عیدیاں جمع کر دی ہیں۔ اس رسالے کے صفحہ ۱۹ پر تحت کے بعد "اشعار متفرق" کے زیر
عنوان غالب کے قطعات و رباعیات نقل ہوئی ہیں، مثلاً: سامان خور و خواب کہاں سے لاؤں

یا رب بہ تماشائے بزم عید اطفال	ایام جوانی رہے ساغر کش حال
آپہنچے ہیں تا سواد اقلیم عدم	اے عمر گذشتہ یک قدم استقبال
نیسو قطعہ وہ ہے جس کا آخری مصرع ہے	روزہ اگر نہ کھاوے تو ناچار کیا کرے

---

[1] قصیدہ "دا خبیہ" تھا آغا میر کی مدح میں[2] ۔۔۔ عبارات ضائع شدہ۔

چوتھا قطعہ جس کا پہلا شعر یہ ہے :

ہے چہارشنبہ آخر ماہ صفر چلو　　　رکھ دیں چمن میں بھر کے تہ خشکبو کی ناند

یہ بھی دیوان غالب نسخۂ عرشی میں (ص ۱۲۰) موجود ہے۔

پانچویں رباعی ہے : "آتشبازی ہے جیسے شغل اطفال" یہ نسخۂ عرشی میں (ص ۲۵۳) ملتی ہے۔
البتہ چھٹی رباعی دیوان غالب نسخۂ عرشی میں نہیں ہے۔ اس کے عنوان میں لکھا ہے :

"رباعیات در مدح تعلق نوروز"

شاہا تجھے با دولت و بخت فیروز　　　فرخ ہو سدا جہاں میں جشن نوروز
ہو صرف شرف اندوز تہہ طالع سے　　　ہر سال حمل میں مہر عالم افروز

اس کے بعد اسی مجموعے میں یہ دو قطعات بھی ہیں جو اگرچہ کلام غالب کے ذیل میں نقل ہوئے ہیں اور ان کے عنوان میں "مرزا نوشہ" لکھا ہوا ہے۔ مگر میرا وجدان کہتا ہے کہ یہ مرزا غالب کے طبع زاد نہیں ہو سکتے۔

عید آئی ہے دل اہل زمانہ شاد ہے　　　عیش سے وابستہ غم سے ہر اک آزاد ہے
عشرت و عیش و طرب یکجا ہوئے ہیں جا بجا　　　ہر طرف اک جشن ہے ہر سو مبارکباد ہے

دوسرا قطعہ بسنت سے متعلق ہے :

گلشن دہر میں بسنت آئی　　　خوب گلدستۂ خوشی لائی
گوش گل سے دیدۂ بلبل　　　دیدۂ گلرخاں تماشائی

اس کا سال انطباع بے چند عاصی نے خدا جانے کون سی صنعت سے برآمد کیا ہے۔ قطعۂ تاریخ ساقط الوزن ہے اور اس کا آخری شعر یہ ہے :

اس عرصہ میں پکارا ہاتف غیبی معوّذ ہو　　　سبحان اللہ ہوئے فارغ کئی تازہ گل دیریں

لاکھ سر مارا مگر کوئی تاریخ برآمد نہ ہوئی۔ میرا قیاس یہ ہے کہ رسالہ مذکور غالب کی زندگی میں چھپا ہے اور نوروز والی رباعی جو اوپر نقل ہوئی غالب ہی کی ہے جو کسی دوسرے مجموعے میں نہیں ملتی۔

(ہماری زبان ۱۵ مارچ ۱۹۶۴ء)

محمد عتیق صدیقی

قران السعدین

(دہلی کا پہلا ادبی رسالہ)

اُردو کلچر کے نشاۃ ثانیہ کی تاریخ میں مرحوم دہلی کالج (۱۸۲۵ء-۱۸۵۷ء) کا ایک خاص مقام ہے۔ مشرقی و مغربی تعلیم سے آراستہ ہو کر طالب علموں کی جو کھیپیں اس کالج سے نکلیں۔ انھوں نے ہمارے ادب اور کلچر کے خزانوں میں بیش بہا اضافہ کیا۔ ماسٹر رام چندر، مولوی کریم الدین، پنڈت موتی لال، محمد حسین آزاد، مولوی ذکاء اللہ، پیارے لال آشوب، ڈپٹی نذیر احمد، مولوی ضیاء الدین احمد خاں، پنڈت دھرم نراین وغیرہ اسی کالج کی پیداوار تھے۔

فورٹ ولیم کالج (۱۸۰۰ - ۱۸۵۵ء) کے بعد دہلی کالج ہی ہمارے ملک میں دوسرا تعلیمی ادارہ تھا جہاں تصنیف و تالیف کی طرف خاص توجہ دی گئی اور اس کام کے لئے ایک مخصوص شعبہ قائم کیا گیا۔ لیکن ان دونوں تعلیمی اداروں کے دائرہ عمل اور ان کے علمی و ادبی کاموں کی نوعیت میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ فورٹ ولیم کالج کے قیام کا مقصد صرف یہ تھا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے نو وارد انگریز سول افسروں کو ہندوستان کی مختلف زبانوں اور ہندوستان کے رسم و رواج، قوانین اور کلچر سے اس حد تک روشناس کر دیا جائے کہ ہندوستانیوں پر حکومت کرنے کے فرض منصبی کو وہ بآسانی پورا کر سکیں۔ اس سلسلے میں یہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ فورٹ ولیم کالج کے عالم وجود میں آنے کے وقت اردو کا خزانہ نثری ادب سے یکسر خالی تھا چناں چہ انگریز طالب علموں کی درسی ضروریات کے لئے قصے کہانیوں کی نیز تاریخ کی کتابیں تصنیف، تالیف یا ترجمہ کرائی گئیں جن کے ماخذ فارسی، عربی اور بھاشا زبانیں تھیں۔ اس سلسلے میں یورپین زبانوں سے مدد لینے کا سرے سے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا جس کی اصلی وجہ یہی تھی فورٹ ولیم کالج کے ہندوستانی منشی جو علمی و ادبی خدمت پر مامور تھے

انگریزی سے قطعاً بے بہرہ تھے۔ آگے چل کر جب انگریزی داں منشیوں کا ملنا نسبتاً ممکن ہو گیا، تو تصنیف و تالیف کا کام بھی بڑی حد تک ختم کر دیا گیا۔

دہلی کالج کی نوعیت فورٹ ولیم کالج سے یکسر مختلف تھی۔ یہ کالج صرف ہندوستانیوں کی تعلیم کے لئے قائم کیا گیا تھا جہاں مشرقی علوم کے ساتھ ساتھ مغربی علوم کی تعلیم بھی دی جاتی تھی چنانچہ دہلی کالج نے جو مصنفین و مترجمین پیدا کئے وہ کم از کم انگریزی زبان سے مزدور پوری واقفیت رکھتے تھے۔ دہلی کی ورناکلر سوسائٹی[1] (۱۸۴۳ء - ۱۸۵۷ء) جو دہلی کالج ہی کے سلسلے کی ایک اہم کڑی تھی اور جس نے دس بارہ سال کی مختصر سی مدت میں سَو سے زیادہ کتابیں شائع کی تھیں، اس کی تقریباً تمام تر مطبوعات علمی تھیں۔ اور ان میں سے بیشتر تالیفات کے ماخذ مغربی کتابیں تھیں۔

دہلی کالج کے اساتذہ نے اردو صحافت کے میدان میں بھی متعدد کامیاب تجربے کئے۔ سب سے پہلے ۱۸۴۵ء میں قران السعدین کا اجرا ہوا۔ اسی سال ماسٹر رام چندر نے فوائد الناظرین جاری کیا۔ یہ دونوں پندرہ روزہ تھے۔ قران السعدین کی حیثیت باضابطہ کار میگزین کی تھی۔ لیکن بعد کو پندرہ روزہ سے ہفتہ وار ہو گیا۔ فوائد الناظرین کے مالک و ایڈیٹر ماسٹر رام چندر دہلی کالج کے پرانے طالب علم اور اسی کالج میں استاد تھے۔ انھوں نے محب ہند کے نام سے ایک ماہوار رسالہ بھی ۱۸۴۷ء میں جاری کیا۔ دہلی کالج کے اساتذہ اور طالب علموں میں صحافت کا مذاق ڈاکٹر اشپرنگر نے پیدا کیا تھا جن کو ۱۸۵۰ء میں کالج کا پرنسپل مقرر کیا گیا تھا۔ ان کا بیان ہے کہ:

"۱۸۴۵ء میں میں نے دلی میں پینی میگزین کی طرز کے ایک باتصویر موقت رسالے کی بنا ڈالی اس کا نام قران السعدین تھا گویا مشرق اور مغرب مشتری اور زہرہ تھے جن کا قران اس رسالے میں ہوا تھا۔ یہ اپنے قسم کی پہلی کوشش تھی۔ گیارہ برس بعد جب میں ہندوستان سے رخصت ہوا تو یہ دیکھ کر مجھے خوشی ہو رہی تھی کہ اس کی تقلید میں بارہ سے زیادہ رسالے نکل رہے ہیں"[2]

---

[1] The Society for the promotion of the knowledge in India through the medium of Vernacular language.

[2] دہلی کالج میگزین (قدیم دہلی کالج نمبر) ۱۹۵۳ء ص ۱۲۶

ڈاکٹر اشپرنگر کے مندرجہ بالا بیان کے پیش نظر راقم الحروف نے "ہندوستانی اخبار نویسی" میں قران السعدین کے سنہ اجرا پر بحث کرتے ہوئے لکھا تھا کہ:

"قران السعدین کے سنہ اجرا کے متعلق محققین میں اختلاف ہے کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اس کا اجرا ۱۸۴۶ء میں ہوا۔ اشپرنگر کے بیان کے بعد اس کی تفصیل میں جانا بے سود ہے۔[1]"

اب میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر اشپرنگر نے ۱۸۴۶ء کی جگہ پر ۱۸۴۵ء سہواً لکھ دیا تھا اور قران السعدین کا اجرا ۱۸۴۴ء ہی میں ہوا۔ اس وقت قران السعدین کی جو جلد پیش نظر ہے اس کے پہلے شمارے پر " نمبرا جلد ۳۔ دوشنبہ مورخہ ۳ جنوری ۱۸۴۶ء" درج ہے۔ اس حساب سے قران السعدین کا پہلا شمارہ جنوری ۱۸۴۴ء میں شایع ہوا ہوگا۔ یہ ہفتہ وار باتصویر اخبار تھا جس میں کالج کی خبروں کے علاوہ نظمیں، غزلیں، قصیدے اور مضامین بھی ہوتے تھے۔ گارساں دی تاسی کا یہ خیال صحیح تھا کہ "اس کا مقصد اپنے وطنوں میں مغربی خیالات کی اشاعت تھا۔"

قرآن السعدین کے پہلے ایڈیٹر پنڈت دھرم نارائن ایک کشمیری پنڈت تھے۔ جو ۱۸۴۸ء کے اواخر میں اس کی ادارت سے سبک دوش ہو کر اندور چلے گئے جہاں مسٹر ہملٹن رزیڈنٹ اندور نے ایک مدرسہ اور ایک مطبع قایم کیا تھا۔ پنڈت دھرم نارائن اس مدرسے کے دوم مدرس اور مطبع کے مہتمم مقرر ہوئے تھے۔ ۱۸۴۹ء میں انھوں نے مالوہ اخبار جاری کیا جو اردو اور ہندی میں شایع ہوتا تھا۔ ۱۸۴۸ء کی ایک سرکاری رپورٹ سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ:

" تمام اخباروں میں قرآن السعدین بہترین معیار کا حامل ہے۔ ان صوبوں [صوبہ شمالی و مغربی آگرہ] میں کسی زبان کا کوئی بھی ہفتہ وار اخبار قران السعدین سے زیادہ متنوع اور قابل قدر معلومات فراہم نہیں کرتا ..... قران السعدین کے ایڈیٹر کا نام دھرم نارائن ہے۔ وہ اسی [دلی] کالج کے سینئر اسکالر رہے تھے

[1] ہندوستانی اخبار نویسی کمپنی کے عہد میں۔ محمد عتیق صدیقی۔ ص ۲۷۹

اسی سرکاری رپورٹ کے مطابق ۱۸۴۸ء میں قران السعدین کی آمدنی ۴۴ روپیہ اور خرچ ۴۰ روپے
ماہانہ تھا قیمت دو روپیہ ماہوار یا بیس روپیہ سالانہ تھی۔ اشاعت کی تفصیل حسب ذیل تھی:

یورپین خریدار	۱۶
مسلمان "	۸
ہندو "	۶
اعزازی	۲۰
تبادلہ	۱۰
مجموعی تعداد اشاعت	۶۰

مطبع العلوم

قران السعدین کے سلسلے میں مطبع العلوم (دہلی) کا نام لینا بھی ضروری ہے جہاں قران السعدین چھپتا تھا اور جس نے شمالی ہند میں اردو کی ترویج و اشاعت میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ مطبع العلوم کے متعلق بھی معلومات سرکاری رپورٹوں سے اخذ کر کے پیش کی جا رہی ہیں:

مطبع العلوم پہلے دہلی کالج ہی کا مطبع تھا لیکن اب کالج سے غیر متعلق ہو گیا ہے اس کی وجہ یہ ہوئی کہ [کالج کی] کمیٹی اس نتیجے پر پہنچی کہ مطبع چوں کہ [کالج کا نہیں ہے بلکہ] نجی ملکیت ہے۔ اس لئے سولہ آنے وہ کمیٹی کے ماتحت نہیں ہے۔ اس لئے گورنمنٹ کی خواہش کے مطابق اس مطبع سے چھپنے والی ہر کتاب کی پوری پوری نگرانی نہیں کی جا سکتی۔ چناں چہ کالج کمیٹی نے یہی مناسب سمجھا کہ مطبع کو کالج کے حدود سے باہر لے جانے کا حکم دیا جائے۔

کالج کے متعلقہ اخبار و رسائل کی طباعت و اشاعت کا جہاں تک تعلق ہے، کمیٹی اس نتیجے پر پہنچی کہ ان کی نگرانی ممکن ہے۔ چناں چہ تجربے کے لئے حسب ذیل شرائط پر تین مہینوں کے لئے اخبار و رسائل کی طباعت کا کام مطبع العلوم کے سپرد کیا گیا۔

۱۔ متعلقہ رسائل کے مضامین طباعت سے پہلے شعبہ عربی کے اول اور دوم مولویوں کو دکھلائے جائیں گے جو حصے ان کو قابل اعتراض معلوم ہوں گے ان کو حذف کرنے کے وہ مجاز ہوں گے۔

۲۔ طباعت کے بعد قران السعدین کی ایک کاپی مقامی کمیٹی کے ممبر کیپٹن جے' پی'
گوجنس کو اور فوائد الناظرین اور محب ہند کی ایک ایک کاپی مقامی کمیٹی کے
عارضی سکریٹری ماسٹر رام چندر کو بھیجی جائیں گی۔ یہ حضرات ان کا بغور مطالعہ کریں گے۔

مطبع العلوم سے حسب ذیل کتابیں ۱۸۴۹ء میں شائع ہوئیں

انتخاب دیوان (دواوین ؟)	اردو شعرا کے کلام کا انتخاب۔
رسالہ قواعد اردو	دہلی کالج کے مولوی امام بخش کی تالیف
گلستاں	اردو ترجمہ
تذکرۃ الکاملین	اردو میں مشہور ادیبوں کے سوانح از رام چند
طب	ذکا اللہ خاں کی طبی کتاب کا نیا ایڈیشن
تحفۃ المومنین	عہد شاہجہانی کی دلی کے ایک طبیب محمد مومن کی طبی کتاب
شرح مقامات حریری	عربی کی مقامات حریری کی شرح' از منشی کریم الدین استاد (دہلی کالج)
چشمۂ فیض	
الفاظ الادویہ	طب اور طبی اصطلاحات کے متعلق دہلی کے مشہور طبیب شریف خاں کی تالیف
فسانۂ عشق	فارسی کی ایک عشقیہ داستان
رسالہ معجزات نبی	
رود ہندی	
تحریر اقلیدس	اقلیدس کی ابتدائی کتاب

رسالہ سریع الفہم	علم الحساب پر رام چندر کی ایک مختصر اردو کتاب
نقشۂ انگلستان	ڈاکٹر ولیم لوگن کے لئے ایک ہزار چھاپے گئے
قول فیصل	
نصیحت نامہ برائے مسلمانان	
حفظ الاسان	

۲۰ طب اکبر حکیم محمد اکبر کی فارسی طبی کتاب

۱۸۴۸ ۱ اخلاقِ جلالی اُردو (مترجم ؟)

۲ باغ و بہار (میرامن)

۳ چشمۂ فیض

۴ مفید الصبیان

۵ جغرافیہ

۶ Mookhtasir Nayah-dan-Fikah 3

۷ ہدایۃ الفضل

۸ دہ مجلس

۹ کتاب پیمائش رڑکی کالج کے لئے

۱۰ پترہ ۱۸۵۰

۱۱ جنتری ۱۸۵۰

۱۲ رسالہ مقناطیس انگریزی سے ترجمہ ازکی ال الدین لکھنوی

۱۸۵۱ ۱۸۵۱ء کے اوائل میں مطبع العلوم کے منیجر دہلی کالج کے سید اشرف علی تھے گزشتہ سال کے اختتام تک حسبِ ذیل کتابیں اس مطبع سے شائع ہوئیں یا زیر طبع ہیں۔

۱ تحریر اقلیدس دہلی کالج کے مولوی ملوک علی نے اقلیدس کی آٹھ کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا ہے

۲ تفسیر عزیزی [شاہ ؟] عبد العزیز کی فارسی تفسیر قرآن جلد اول
۳ ایضاً ایضاً جلد دوم

۴ اخوان الصفا مولوی اکرام علی نے فورٹ ولیم کالج کے مسٹر لوک ہارٹ اور مسٹر ٹے لر کی تحریک پر عربی سے اردو میں ترجمہ کیا

۵ ہندی ڈکشنری (اردو لغت ؟) سر سید محمد کے لئے چھاپی گئی

۶ علم آلات رادھاکشن کے لئے چھاپی جارہی ہے

۷ جبر و مقابلہ امدو الجبرا رام چندر اور مولوی کریم بخش کے لئے

۸ رسالہ ٹیش ـ رام چندر اور مولوی کریم بخش کے لئے
۹ مقامات ہندی زیر طبع ہے
۱۰ Brief Survey of History . ابھی شائع نہیں ہوئی
۱۱ میزان الطب محمد اکبر کی طبی فارسی کتاب کا سبحان علی نے اُردو میں ترجمہ کیا ہے
۱۲ افغانستان ابھی شائع نہیں ہوئی
۱۳ علاج الامراض ایضاً
۱۴ اخلاق جلالی ایضاً براے میر نثار علی تاجر
۱۵ گلستاں ایضاً اردو
۱۶ بیتال پچیسی ایضاً
۱۷ پترا سمبت ۱۹۰۰ کے لئے
۱۸ جنتری ۱۸۵۲
۱۹ نصیحت نامہ مسٹر ایبٹ نے خیراتی اسکولوں میں تقسیم کرنے کے لئے چھپوایا
۲۰ انجیل ایضاً ایضاً ایضاً
۲۱ ... ابھی شائع نہیں ہوئی

۱۸ ۱۸۵۸ء میں مطبع کے اہتمام میں تبدیلی رونما ہوئی۔ چنانچہ اس سال کے اختتام پر کریم بخش مطبع العلوم کے مہتمم مقرر ہوئے ہیں۔

گزشتہ سال حسب ذیل کتابیں اس مطبع نے لیتھو سے چھاپی ہیں۔ ان میں سے کچھ بے حد اچھی اور مفید درسی کتابیں بھی ہیں۔

۱ بیتال پچیسی
۲ علاج الامراض (۱۸۵۱ء میں زیر طبع تھی)
۳ گلستاں اردو میں (ایضاً)
۴ مقامات ہندی طباعت ابھی مکمل نہیں ہوئی
۵ علم آداب
۶ نکاح

۷ قواعد فارسی
۸ اخلاق جلالی اردو
۹ طبی
۱۰ بہار عجم طباعت ابھی مکمل نہیں ہوئی
۱۱ کلیات سودا
۱۲ شرح قصائد سودا
۱۳ رسالہ کاتب
۱۴ تاریخ بنگالہ (زیر طبع ہے)
۱۵ باغ و بہار ابھی مکمل نہیں ہوئی

اس وقت قران السعدین کی تیسری جلد (۱۸۴۸-۱۸۴۹) ہمارے پیش نظر ہے[۱] جس کے اقتباسات ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں۔ ان اقتباسات کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے:
(۱) دہلی کالج کی خبریں (۲) علمی، ادبی و صحافتی خبریں (۳) مختلف خبریں
تیسری جلد کے پہلے شمارے میں ناظرین اور معاونین اخبار کو نئے سال کی مبارکباد پیش کی گئی تھی ہم سب سے پہلے اسی کو نقل کرتے ہیں:

شکر بجناب باری کہ بامداد و استعانت محبان قران السعدین کے سنہ ۱۸۴۸ء بخوبی تمام ہوا اور ان کی عنایت و مہربانی سے امید قوی ہے کہ سال آئندہ بھی اس در کا ہو۔ ہم بہت ممنون ہیں اپنے مہربانوں کے کہ انھوں نے بھیجنے اخبار اور مضامین سے مرہون عنایت کیا اور یہی آرزو ہے کہ اس طریقہ رسل و رسائل کو جاری رکھیں یہ امداد دوستوں کے جو ہر طرح سے مدد کریں، رونق اخبار کی متعذر ہے۔ اب یہی آرزو ہے کہ سب دوستوں پر سال نو مبارک ہوئے[۲]

نئے سال کی مبارکباد کے بعد مندرجہ بالا تقسیم کے مطابق قران السعدین کی خبروں کا انتخاب پیش کیا جارہا ہے۔

---

[۱] قران السعدین کی یہ جلد نیشنل آرکائیوز آف انڈیا، نئی دہلی کے فارسی شعبے کے کتب خانے میں موجود ہے۔
[۲] قران السعدین جلد ۳ نمبر ۳ نمبر ا مورخہ ۲ جنوری ۱۸۴۸ء ص ۲۵

دہلی کالج کی خبریں

(۱) سالانہ امتحان

امتحان سالانہ مدرسہ سرکاری نے اختتام پایا۔ مگر تقسیم انعامات لفٹنٹ گورنر کے آنے پر ملتوی ہے اور ڈاکٹر اشپرنگر صاحب بھی تا آنے لفٹنٹ گورنر کے یہیں مقیم رہیں گے۔[له]

(۲) دہلی کالج میں لفٹنٹ گورنر کا ورود

ساتویں ماہ فروری کو مدرسہ دہلی میں عجب جلسہ ہوا کہ قلم کو یارائے بیان نہیں۔ واضح ہو کہ ۹ بجے سے بڑا کمرہ مدرسہ کا واسطے اجلاس جناب لفٹنٹ گورنر بہادر کے آراستہ کیا گیا تھا۔ قرینہ سے کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ مقابل ایک دوسرے کے تصویریں جناب ترلیوین صاحب اور موہن لال اسکوائر کی دیواروں پر لگی تھیں۔ بیچ میں ایک بہت چوڑی میز دھری تھی۔ اس میز پر کاغذ امتحان طلبا کے قرینہ سے بہ ترتیب دھرے تھے اور کتابیں انعام کی معہ تمغہ نقرئی کے چنی ہوئی تھیں بڑے بڑے رئیس شہر کے مثل نواب ضیاالدین خاں اور مفتی محمد صدرالدین خاں صدرالصدور اور میرزا سید حسین خاں اور زین العابدین خاں وغیرہ کرسیاں لگائے بیٹھے تھے۔ برابر کے کمرہ میں جمیع اسکالر اپنے اپنے نمبروں کے موافق بہ قرینہ بیٹھے تھے اور انتظار جناب لفٹنٹ گورنر بہادر کا کر رہے تھے قریب ۱۱ بجے کے صاحبان اہل سیف مع میموں کے رونق بخش محفل ہوئے اور بہت سے اہل قلم مثل صاحب کمشنر اور صاحب جج اور صاحب مجسٹریٹ اور سکتر گورنمنٹ وغیرہ کے اون کے ہمراہ آئے اور سارا کمرہ رئیسان ہندوستانی اور صاحبان انگریز اور میموں سے خوب بھر گیا۔ بعد تھوڑی دیر کے جناب لفٹنٹ گورنر بہادر ڈاکٹر سپرنجر [اشپرنگر] صاحب پرنسپل مدرسے سے خلوت میں گفتگو کر کے کرسی پر آ بیٹھے اور مسٹر سٹوارڈ مدرس سیوم انگریزی نے کیفیت مدرسہ کی جمیع حاضرین کو پڑھ کر سنائی اور پھر لفٹنٹ گورنر نے جمیع حاضرین کو مخاطب کر کے واسطے سنانے کاغذ امتحان بعض اسکالروں کو ارشاد کیا چنانچہ چھدت موتی لال اسکالر جماعت اوّل نے اور کئی طلبا جماعت اعلیٰ کے خوب کیفیت سے

له قران السعدین جلد ۳ نمبر ۱ - ۳ جنوری ۱۸۴۸ء

سنائے اور جمیع صاحبین اُن کے سننے سے خوش ہوئے بعد اس کے صاحب جلیل القدر لفٹنٹ گورنر
بہادر نے تقسیم انعام شروع کیا۔ اول پنڈت موتی لال کو ایک تمغۂ نقرئی معہ سارٹی فکٹ اسکالری
پچیس روپیہ ماہیانہ کے عنایت کیا اور فرمایا کہ تمھاری تقریر و تحریر سے تمھاری استعداد ہم کو خوب معلوم
ہوئی اور ہم تم سے بہت خوش ہیں۔ بلحاظ تمھاری محنت کے جو تم نے علم و ادب میں کی ہے یہ تمغہ دیا جاتا
ہے۔ بعد اس کے لالہ لچھمن لال اسکالر جماعت دویم کو سارٹی فکٹ اور تمغۂ نقرئی واسطے تحصیل جمیع فروع
علوم کے مرحمت فرمایا بعد اس کے ایک تمغۂ نقرئی گلی احمد طالب علم مدرسۂ عربی کو عنایت کیا اور زبان شیریں
سے اوس کی دل دہی کی۔ بعد ازیں ایک اسکالری واسطے تحصیل علوم ریاضی کے جو صاحب مجسٹریٹ
دہلی کی طرف سے مقرر ہوئی ہے پنڈت گوپال سہائے کو دی اور ایک اسکالری کوپ صاحب مہتمم
دہلی گزٹ کی طرف سے ماسٹر فانی کو واسطے بہم پہنچانے استعداد تصویر کشی کے دی۔

بعد اس کے جناب لفٹنٹ گورنر ایک ایک اسکالر اعلیٰ مدرسہ انگریزی اور فارسی کو
بلاتے تھے اور زبان شیریں سے اُس کی استعداد کی تعریف کر کے سارٹی فکٹ عنایت کرتے تھے۔
جب تقسیم انعام سے فراغت ہوئی تو صاحب ممدوح نے زبان مبارک سے جمیع حاضرین سے
مبابا اپنی خوشنودی اور تعریف مدرسہ اور انتظام کے کلام کیا اور سب خورد و بزرگ کو اپنی
تقریر سے خوشنود۔

بعد اس کے استعداد طلباء مدرسہ پر گفتگو آئی اور نواب محتشم الدولہ [لفٹنٹ گورنر]
نے فرمایا کہ ہم کو اظہار اس امر سے بہت خوشنودی ہوئی کہ اسکالران مدرسہ دہلی اوپر مدرسی
بنارس اور اکبر آباد اور بریلی اور لکھنؤ اور اندور وغیرہ کے معمور ہیں اور نظر قابلیت اپنے کو
ترویج علوم مفیدہ میں کام میں لاتے ہیں۔ فی الحقیقت اس باب میں تعریف نواب مفخر الدولہ
کی بہت بجا ہے کیونکہ اکثر مدرس مدارس سرکاری وغیرہ کے اسکالران مدرسہ دہلی میں سے ہوتے ہیں۔
اس سے زیادہ اور کون سا امر ہے جو یہاں کے طالب علموں کی علمیت اور آگہی پر دال ہو۔

اب چونکہ دو بجنے کو تھے تو جناب لفٹنٹ گورنر بہادر سب صاحبان سے رخصت ہو کے
اپنے سرادق اقبال کو تشریف فرما ہوئے اور جناب تھورنٹن [تھورنٹن] صاحب اپنے سکتر کو
واسطے امتحان طلباء مدرسہ کے چھوڑ گئے چنانچہ صاحب موصوف نے جماعت دویم انگریزی سے

یکر جماعت پنجم تک کا امتحان لیا۔ اور اب چونکہ چار بجنے کا وقت آگیا تھا تو وہاں سے تشریف لے گئے
اور طلبا کو ہشتم ماہ حال سے تیرہ ماہ مذکور تک چھٹی عنایت کی۔
اب کی بار اس مدرسہ کے اندر کل ایک سو دس اسکالر مقرر ہوئے چونکہ اندراج جمیع اسما
کا موجب تطویل ہے اس واسطے فقط اسکالران اعلیٰ کا نام لکھا جاتا ہے۔

مدرسہ انگریزی

پنڈت دھرم نرائن	سے (۳۰ روپے)
پنڈت موتی لال	(۲۵ روپے)
مولوی محمد اسحاق	(دس روپے)
پریم نرائن	(نو روپے)
محمد علی	"
لکھن لال	"

اٹھتالیس طلبا دس سات روپے سے چار روپیہ تک اسکالر ہوئے۔

مدرسہ عربی

علی اکبر	(بیس روپے)
خدا بخش	(اٹھارہ روپے)
عبدالرحمٰن	(سولہ روپے)
ریاض الدین	(پندرہ روپے)
علی اصغر	(نو روپیہ)
کریم بخش	"

تیس اسکالر آٹھ روپیہ سے چار روپیہ تک اور مقرر ہوئے۔

فارسی میں

گدادھر ناتھ	"
دھرنی دھر	(چھ روپے)

صحیح

بہاری لال	صہ (پانچ روپے)
قاسم علی	صہ "

تیس اسکالر چار چار روپیہ کے

پاٹ شالہ میں

بال مکند	لعہ (نو روپے)
لکھمن لال	للعہ (چار روپے)

(نوٹ) بواسطے لکھنے حال مدرسے کے اخبار یوم معمولی پر جاری نہ ہوا۔ کیفیت سالانہ مدرسہ دہلی اور حال ملاقات رؤسائے گرد و نواح شہر کا اگلے پرچے میں درج ہوگا۔[1] فقط

(۳) تنخواہوں میں اضافہ

بموجب حکم جناب لفٹنٹ گورنر بہادر دام اقبالہٗ کے تنخواہ ماسٹر رام چندر مدرس علوم انگریزی کے پچاس روپے ماہوار بڑھائی گئی۔

ماسٹر ابرٹ صاحب مدرس سویم مدرسہ انگریزی مدرس دویم بمشاہرہ ایک سو پچاس روپے کے مقرر ہوئے اور مسٹر سٹوارڈ صاحب کے مواجب مقرری میں تیس روپیہ اضافہ ہوئے۔

(۴) مسٹر فےلن کا تبادلہ

مسٹر فےلن صاحب مدرس اول مدرسہ میرٹھ جو بعد شکست ہونے مدرسہ مذکور کے مدرسہ دہلی میں کار تدریس کا کرتے تھے اس مدرسے سے مدرسہ آگرہ میں منتقل ہوئے۔ طلباء اعلیٰ مدرسہ دہلی بہ صد زبان عنایات و نوازشات صاحب موصوف کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ ایزد تعالیٰ جناب موصوف کو ہر جگہ محیط عزت و آبرو رکھے۔[2]

(۵) خلاصہ کیفیت مدرسہ دہلی بابت سال گذشتہ جو روبرو لفٹنٹ گورنر بہادر کے پڑھی گئی

۱۸۴۸ء کے اندر ۲ طالب علم ۳۳۳ بھرتی ہوئے تھے اور اسی سال میں ۱۲۲ نے مدرسہ چھوڑ دیا۔ پیچھے کی جماعت میں بہت طالب علم ہوا کرتے تھے لیکن جب سے فارسی مدرسہ کے اندر یہ حکم

[1] قران السعدین جلد ۳ نمبر ۶، مورخہ ۱۶ فروری ۱۸۴۹ء
[2] ایضاً

ہوا ہے کہ کوئی لڑکا جس نے گلستاں نہ پڑھی ہوگی داخل نہ کیا جاوے گا تب سے یہ بات نہیں ہے۔ انگریزی
جماعتوں میں بھی بہت تھوڑے لڑکے بہ نسبت سابق کے ہیں۔ اس بات سے مدرسہ کی ترقی ظاہر ہے،
کیوں کہ پہلے نیچے جماعتوں میں ابجد خواں بہت ہوا کرتے تھے، اب خلاف اس کے جوں کہ لڑکے گھروں سے
تھوڑا تھوڑا پڑھ آتے ہیں، تو مدرسہ میں اونچی جماعتوں میں داخل ہوتے ہیں اور اس لیے ابجد خوانوں
کی بہت کثرت نہیں۔

فی الحقیقت یہ بہت ترقی کی بات ہے لیکن اس امر سے اُن اصولوں کی خوبی کا جس پر
انتظام اس مدرسہ کا مبنی ہے، امتحان قرار واقعی نہیں ہو سکتا۔

ہر شخص جس نے اہل ہند کے تباہ اور قابل رحم کے حال کو دیکھا ہوگا سوال کرے گا کہ کس قدر
مدرسہ جہاں مبالغ کثیر صرف ہوتا ہے ہندوستانیوں میں اُس جہالت کے دور کرنے میں کامیاب
وا ہے جو سیکڑوں بدی کا موجب ہے جس کے سبب سے ہندوستان میں افلاس چھا رہا ہے اور جس کے
ثر سے ہندوستانیوں کا دل رنگ تعصب میں آلودہ ہے اور جس سے مضرت طرح طرح کی ان
لوگوں کے حق میں متصور ہے جو اشخاص کہ اس طور پر نظر کرتے ہیں اور ان کو اس بات کے سننے
سے بہت خوشی حاصل ہوئی کہ تعلیم بہ وساطت زبان اردو کے روز بروز ترقی پاتی جاتی ہے۔
کتب تاریخ اور علوم مدرسہ فارسی و انگریزی میں ایک ہی سے ہیں جو لوگ کہ زمین انگریزی کو
نہیں جانتے اور انھوں نے [بھی] علوم انگریزی اسی قدر تحصیل کیے ہیں جس قدر کہ ان طالب علموں
نے جو اس زبان کے ماہر ہیں اور جنھوں نے اس زبان کی تحصیل کی ہے وہ اپنے ہم وطنوں کے
خلاف عادت کے بالکل بے گانہ رائیں اور خیالات زبان سے ادا کر سکتے ہیں اور ایک عرصہ
میں یہ رائیں ایسی ہو جاویں گی کہ وہ بے گانہ نہیں ہیں بلکہ ہندوستان زا کی۔

علاوہ دو اخباروں کے جو پہلے طالب علموں کی استعانت سے مقرر ہوئے ہیں۔ ایک
ماہوار رسالہ زبان اُردو میں واسطے دینے آگہی اور اطلاع ضروری کے ایسے ہندوستانیوں
کو جو مدارس سے دور ہیں اور وہاں تک رسائی نہیں رکھتے ان ہی طالب علموں نے جاری کیا
ہے۔ اور خوشی کی بات ہے کہ اس کے خریدار روز افزوں ہوتے جاتے ہیں۔

سالہائے گذشتہ میں اکثر لوگ متعلق مدرسہ کے علاقہ ہائے مدرس میں مدارس گرد و نواح

کے مقرر ہوئے ہیں اور طالب علموں وغیرہ میں واسطے تربیت کرنے اپنے ہم وطنوں کے آنا میل اور جنا ہش دلی ہے کہ انھوں نے اپنی جیب خاص سے روپیہ خرچ کر کے ایک مکتب واسطے تعلیم بے کس یتیموں کے شہر دہلی میں مقرر کیا ہے۔ ان جمیع باتوں سے ظاہر ہے کہ مدرسہ دہلی راہ راست میں طے منازل کرتا جاتا ہے، اور اُس کے وسیلے سے علم کو ترقی ہے۔

بہت خوشی کی بات ہے کہ صاحبان ذی استعداد اس مدرسہ کے معاون ہوتے جاتے ہیں۔ ۱۸۴۹ء میں جب مدرسہ میں انعام تقسیم ہوا تھا (تو) روبرٹ صاحب مجسٹریٹ دہلی نے اقرار کیا تھا کہ ہم سال آیندہ میں اُس طالب علم کو انعام دیں گے جو ریاضی میں خوب استعداد بہم پہنچا دے گا، یعنی اقرار ہنری کوپ صاحب ایڈیٹر اخبار دہلی گزٹ نے بھی اس شخص کے واسطے مقرر کیا تھا جو تصویر کشی میں دست گاہ میسر کرتا۔ امیدواروں میں سے گوپال ہمارے علم ریاضی میں اور ماسٹر رامی تصویر کشی میں کامیاب ہوئے۔ اور صاحبان موصوفین نے انعام کو تین تین روپیہ کی سکالری ماہیانہ میں مبدل کر دیا۔ چنانچہ لفٹننٹ گورنر بہادر نے ان سکالروں کو سارٹی فکٹ بھی عنایت کئے۔ واضح ہو کہ گوپال سہائے نے علم ریاضی زبان اردو میں تحصیل کیا ہے۔

جناب گبنس صاحب جج دہلی اور روبرٹ صاحب مجسٹریٹ دہلی نے بعض طلبا کو کار دفتر کا لکھایا اور اون کو علاقے بھی مرحمت فرمائے۔ اس لئے صاحبان موصوفین اور منشیان سے (یعنی) جو ہندوستانیوں کی تعلیم کے معاون اور ترقی خواہ ہیں مستحق تحسین و آفرین۔ سال گزشتہ میں کئی چیزیں قیمتی اس مدرسے میں موصول ہوئی ہیں تفصیل ان کی یہ ہے:

(۱) گورنمنٹ نے ایک بت سرچارلس مٹکاف صاحب کا دہلی میں بھیجا تھا۔ جناب صاحب ریذیڈنٹ اس شہر نے اوسے مدرسہ میں رکھوا دیا مگر اب تک اس کے نصب کرنے کا مکان نہیں تیار ہوا۔

(۲) موہن لال اس کور (اس کوائر) نے جو اسی مدرسہ کا تعلیم یافتہ ہے، تولیفین صاحب اپنے دوست اور خیر خواہ مدرسہ کی تصویر مع ایک ایسی ہی اپنی تصویر کے مدرسہ ہذا میں ارسال کی ہے۔ چنانچہ یہ دونوں تصویریں مقابل ایک دوسرے کے کمرۂ امتحان مدرسہ میں رکھی ہیں۔

(۳) لوکل کمیٹی نے ایک صندوق آلات کیمیاگری کا مع ایک تحفہ خوردبین کے اس مدرسہ کے واسطے اس سال میں خریدا ہے۔

ہم امید کر سکتے ہیں کہ ایک زمانہ میں مدارس سرکاری مرکز علم و ہنر کے بن جاویں گے اور کتب علم وہیں تیار ہوں گی، تاکہ وہ صاحب جنھوں نے تقسیم انعام کے دن مدرسہ میں قدم رنجہ فرمایا، بخوبی دریافت کرلیں کہ سکالران اعلیٰ نے علوم میں کس قدر استعداد بہم کی ہے۔[1]

(٦) حال اوس پنچایت کا جو واسطے دست گیری اور یتیموں کے دہلی میں مقرر ہوئی ہے پھر لکھا جاتا ہے

بہت خوشی کی بات ہے کہ اس پنچایت میں ترقی روز افزوں ہے۔ ۷۱ بے کس بیوہ جن کو کوئی سہارا نہیں ہے صاحبان پنچایت کی دست گیری سے پرورش پاتے ہیں اور چالیس سے زیادہ یتیم فوائد تربیت سے مستفید ہوتے ہیں۔ اہل پنچایت نے چند عرصہ سے ایک لائق مدرس واسطے تربیت اطفال کے مقرر کر دیا ہے اور مکتب کو ایک ایسے مقام پر قرار دیا ہے کہ وہاں ایک شخص اہل پنچایت میں سے ہر روز مکتب کے کاروبار کو دیکھتا ہے اور امتحان طلبہ (طلباء) کا لیتا ہے۔

کئی روز ہوئے کہ امتحان سالانہ مکتب کا ہوا اور کئی طالب علموں نے خوب امتحان دیا اور حصول انعام سے بہرہ ور ہوئے۔ ہمارے نزدیک یہ امر اوپر استعداد اور کوشش مدرس کے دال ہے۔

ہمارے نزدیک اہل پنچایت کو اس مکتب کے باب میں دو چیزوں کا سب سے زیادہ خیال رکھنا چاہیے ایک تو یہ کہ اوس مکتب میں اکثر کتابیں زبان اردو میں سکھلائی جاویں کیونکہ بوسیلہ اِس زبان کے تھوڑے سے عرصہ میں لڑکا بہت کچھ تحصیل کر لیا کرے گا اور دوسرے مدرس مدرسہ کو یہ بھی لحاظ رہے کہ طالب علم بہت سا نہیں پڑھیں بلکہ تھوڑا پڑھیں اور سمجھ کر پڑھیں ہم نے اکثر شہروں کے مکتبوں کا امتحان لیا ہے اور پایا ہے کہ ایک خورد سال لڑکا بڑی کتاب اوس کی تحصیل کرتا ہے اور وہ اس معنی بھی بتا دیتا ہے۔ لیکن اگر مدعا پوچھو تو نہیں معلوم۔ یا اکثر لفظ جو اوس کے سبق میں آتے ہیں ان کے سب کے معنی اوسے نہیں معلوم ہوتے۔ غالب ہے کہ اس مکتب میں ایسا نہ ہوگا چونکہ کئی خریدار ہمارے اخبار کے اہل پنچایت میں داخل ہیں، اس واسطے ہم نے یہ باتیں قلم بند کیں۔

---

[1] قران السعدین، جلد ۳ نمبر ۱۲، موٴرخہ ۳۰ مارچ ۱۸۴۸ء

جن دنوں میں کہ نواب لفٹنٹ گورنر رونق افروز دہلی تھے اوس زمانہ میں ایک کیفیت اس مکتب کی اون کی خدمت میں پیش ہوئی تھی۔ چنانچہ نواب محتشم نے سپرنگر (اشپرنگر) صاحب پرنسپل مدرسہ کو ارشاد کیا تھا کہ تم اس کو جا کے دیکھو۔ چنانچہ صاحب موصوف نے مکتب میں جا کے لڑکوں کا امتحان لیا۔ اور کئی گونہ محک امتحان پر کامل عیار پایا سو غالب ہے کہ لفٹنٹ گورنر بہادر کو رپورٹ کریں گے اور نواب صاحب موصوف بھی غربا پروری کر کے کچھ مدد کریں گے۔ اور اگر رئیسانِ والا ہمت اس کار نیک میں ساعی ہوں تو کچھ عجب مناسب ہے۔ اور غربا پروری متصورہ صاحبان بہ نہایت اپنی طرف سے اس کار خیر میں بدل و جان ساعی ہیں مگر لیکن مدانس ماز نو کی اصلاح کی ہے جو واسطے رفاہ غربا کے ضرور ہیں۔[1]

(۷) ڈاکٹر اشپرانگر کی روانگی لکھنؤ

جناب ڈاکٹر اشپرانگر صاحب پرنسپل مدرسہ ۲۲ تاریخ ماہ حال کو تشریف فرمائے لکھنؤ ہوئے اور جناب ...صاحب اون کی جگہ قائم مقام کام کرتے ہیں۔[2]

(۸) مٹکاف اور ڈاکٹر راس کی آمد

کئی روز ہوئے جناب متکف (مٹکاف) صاحب بہادر رجنٹ دہلی مدرسہ سرکاری میں تشریف لائے اور کئی جماعتوں کا امتحان بھی لیا۔ جماعت اول میں قدم رنجہ فرمایا۔ طلبا درجہ نے بہ وسیلۂ آلات کے تجربے بجلی اور گیس بے زم وغیرہ کے کر دکھائے۔ صاحب موصوف بہ غور ملاحظہ کرتے رہے اور طلبا کی تقریر سے خوش ہوتے تھے۔ چلتے وقت زبان مبارک سے ارشاد کر گئے کہ جو کوئی طالب علم چھ مہینے کے اندر تاریخ ہندوستان میں نقدِ قابلیت حاصل کرے گا اور محک امتحان پر کامل عیار نکلے گا اوس کو ہم تمغۂ طلائی دیں گے۔

دو تین دن کے بعد جناب ڈاکٹر روس صاحب تشریف فرمائے مدرسہ ہوئے اور تجربات فن بجلی بنانے وغیرہ کے ملاحظہ کئے اور خوردبین میں سے بہت سی چیزوں کو دیکھا۔ چلتے وقت فرما گئے کہ جو کوئی امتحان سالانہ پر علم ہیئت میں کامل عیار اوترے گا اوسے ایک تمغۂ عنایت ہوگا۔

---

[1] قران السعدین جلد ۳ نمبر ۴ مورخہ ۱۰ مارچ ۱۸۴۸ء

[2] قران السعدین جلد ۳ نمبر ۲ مورخہ ۲۸ فروری ۱۸۴۸ء

کل ارباب کمیٹی مدرسہ میں جمع ہوں گے اور چند امور متعلق مدرسہ پر گفتگو کریں گے۔ غالب ہے کہ اوس روز کئی اور صاحب بھی انعام مقرر کریں گے۔

(۹) قران السعدین سے دھرم نراین کی سبک دوشی

اظہار از طرف مہتمم (قران السعدین)

مہتمم اخبار ہذا خدمت میں اون جمیع صاحبان والاہمت اور دوستان شفیق کے جن کی عنایت و نوازش بیچ ترویج اس پرچہ اخبار کے بطول مبذول تھی بقصد اظہار نیازمندی عرض کرتا ہے کہ اس فدوی بے مقدار کو جناب ہملٹن صاحب بہادر دام اقبالہ رزیڈنٹ مالوہ نے اپنی محض والاہمتی اور بزرگی کے کا فقط اوپر اہتمام مطبع اور مدرس ثانی مدرسہ اندور کے مامور فرمایا ہے۔ اگر میں ہمہ تن زبان ہوں تو بھی اس عنایت کا ادائے شکر نہیں کر سکتا۔ از بس کہ عزم روانگی اوس دیار کا درپیش ہے اس واسطے جمیع صاحبان بزرگ طینت سے امید ہے کہ وہ بطور قدیم مہتمم ثانی (قران السعدین) پر بھی اپنی عنایت اور شفقت مبذول رکھیں اور یکم دسمبر ۱۸۴۸ء سے جمیع خطوط متعلق داد و رسید قیمت اخبار کی سید اشرف علی مہتمم مطبع العلوم کے نام ارسال فرماویں اور خدمت میں اون جمیع ہم پیشہ کے جن سے محب تعارف رکھتا ہے، یہ عرض ہے کہ جن جن صاحبوں کی خدمت میں کبھی سہو سے گستاخی ہوئی ہو وہ بھی برائے مہربانی معاف کریں۔ اون کی خدمت میں بجز عرض نیاز کے اور کیا لکھا جائے فقط[1]

(۱۰) **التماس** بیچ خدمت ناظرین اخبار کے یہ عرض ہے کہ عاجز کا اہتمام اسی اخبار تک تھا۔ اب بہ سبب عن قریب روانگی اندور کے اس خدمت سے دست بردار ہوا۔[2]

(۱۱) پنڈت دھرم نراین کے جانشین

باہتمام محمد حسین مدرس انگریزی مطبع العلوم واقع گذر کشمیری دروازہ میں چھپا۔[3]

(۱۲) حال نمبر چہارم محب ہند

چوتھا نمبر اس رسالے کا موصول مطالعہ ہوا۔ فہرست اوس کے مضامین کی یہ ہے:

(۱) تاریخ سلطنت پنجاب (۲) حال نکلنے مسجد کا کوٹلہ فیروز شاہ میں (۳) خزیات حضرت شاہ دہلی

---

[1] قران السعدین جلد ۳ نمبر ۴۰، مورخہ ۲۸ نومبر ۱۸۴۸ء [2] قران السعدین جلد ۳ نمبر ۴۱ مورخہ ۵ دسمبر ۱۸۴۸ء

[3] قران السعدین جلد ۳ نمبر ۵، مورخہ ۱۱ دسمبر ۱۸۴۸ء

مؤلف نے مضمون اول کو ابتدائے عمل داری سکھوں سے آج تک بطور ایجاز و اختصار ایک لطف کے ساتھ ادا کیا ہے، اور وہ فی الحقیقت قابل سیر ہے۔ اور محنت مؤلف کی مستحق تحسین۔ حال سجد کا ہم بطور اختصار بیان کر چکے ہیں، کچھ ضرورت بیان کی بار دیگر نہیں دیکھتے[1]

(۱۳) محب ہند (نمبر ۵)

نمبر پانچویں اس رسالہ کا نظر سے گذرا۔ چوں کہ مضمون دوم یعنی طریقہ دریافت کرنے کسوف اور خسوف کا مفید تر اور آسان تھا اس واسطے ہم نے بھی اسے لفظاً بہ لفظاً اپنے اخبار میں درج کیا ہے۔ فقط

(جلد ۲ نمبر ۴۔ ۲۵ جنوری ۱۸۴۸ء ص ۲۸)

(۱۴) محب ہند (نمبر ۶)

(۱) خاندان مغلیہ اورنگ زیب کی سلطنت تک

(۲) بیان برف وغیرہ

(۳) ذکر اس آلہ کا جس سے ڈوبا ہوا اسباب سمندر میں سے نکال سکیں۔

(۴) چند غزلیات[2]

(۱۵) محب ہند (نمبر ۹)

محب ہند

نمبر نواں اس رسالہ مختصر اور مفید کا موصول مطالعہ ہوا۔ اس کے مطالب کی فہرست یہ ہے

(۱) بقیہ تاریخ ہندی (۲) حال پولیس قیصر روم کا (۳) خواب (۴) حال سر آئزک نیوٹن

(۵) حال کن نوششش کا (۶) مترک آہنی کا حال

چوں کہ جو مضمون کہ زیادہ دلچسپ ہیں، وہ طویل ہیں۔ اس باعث ان اوراق میں درج نہیں ہو سکتے۔ نمونہ کے واسطے حال کنفوششش لکھا جاتا ہے۔

یہ نامی کہ بہرہ علم و ہنر سے خوب رکھتا تھا۔ ملک چین میں زمانہ سلف میں ہوا ہے۔ وہ مثل زرتشت اور حضرت موسیٰ کے لوگوں کو پند و نصیحت دیا کرتا تھا اور اکثر آدمی اس کو بنگا

---

[1] قران السعدین جلد ۳ نمبر ۲ مورخہ ۱۰ جنوری ۱۸۴۸ء

[2] قران السعدین جلد ۳ نمبر ۱۴ ار فروری ۱۸۴۸ء

جانتے تھے اور ادب کرتے تھے۔ چونکہ اُس کے عہد کے فغفور نے اس کے نصایح و پند پر عمل نہ کیا وہ علاقہ بادشاہی سے دست بردار ہو کے کسی اور نواح میں نکل گیا اور اُس نواح کے لوگوں کو اپنے پند و نصایح سے مستفید کیا۔ حسب و نسب اُس کا اعلیٰ ہے، بلکہ یوں مشہور ہے کہ وہ خاندان شاہی میں سے تھا۔ یہ شخص آج تک بہ سبب نیکی اور اخلاق اور استقلال اور اعتدال اور دانائی کے شہرۂ آفاق ہے۔ ملک کو چین اور چین میں اکثر لوگ اُس کے طریقہ پر عمل کرتے ہیں[1]

(۱۶) ماسٹر رام چندر کی تنخواہ میں اضافہ

مدرسہ دہلی

بموجب حکم لفٹنٹ گورنر بہادر دام اقبالہٗ کے تنخواہ ماسٹر رام چندر مدرس علوم انگریزی کی پچاس روپیہ سے سو روپئے بڑھا دی گئی۔[2]

(۱۷) ماسٹر رام چندر کو صدمہ

لالہ رام چندر معلم علوم انگریزی مدرسہ دہلی خوبی ایام سے گھوڑے پر سے گر پڑے اور سر میں آسیب شدید پہنچا۔ دو روز تک غفلت لاحق حال رہی لیکن بہت شکر کی بات ہے کہ عنایت الٰہی اون کے شامل حال ہوئی اور بہ استعلاج جناب ڈاکٹر رکس صاحب بہادر اور لالہ چمن لال کے اب انھیں بہت صحت حاصل ہے اور روز بروز افزاں تر حاصل ہوتا جاتا ہے۔ کوئی شخص اُن کے دوستوں اور شاگردوں میں سے ایسا نہیں ہے کہ بصد نیاز واہب العطایا کی خدمت میں واسطے حصول صحت مریض کی دعا نہ مانگتا ہو۔ اور یہ امر کیوں نہ ہو جب یہ شخص جمیع صفات حسنہ سے موصوف ہوا، اور ما ت دن افادہ خلایق اور ترویج علم میں ساعی ہے[3]

(۱۸) چند مطبوعات دہلی کالج

الحمد کہ تاریخ ابو الفدا تین جلدوں میں چھپ کر تیار ہوئی ہے اور حقیقت میں یہ تاریخ ایسی ہے کہ اس کے روبرو اور کتب سیر بے فروغ ہیں اور قیمت اس کی مبلغ (بارہ) روپے ہے۔

---

[1] قران السعدین جلد ۳ نمبر ۲۳ - ۵ جون ۱۸۴۸ء [2] قران السعدین جلد ۳ نمبر ۱۲ مورخہ ۲ مارچ ۱۸۴۸ء

[3] قران السعدین جلد ۳ نمبر ۳۰ مورخہ ۱۱ جولائی ۱۸۴۸ء

تذکرہ ہندی جس کے مولف مولوی کریم الدین اور مسٹر فیلن صاحب ہیں بہت خوبی کے ساتھ
انتخاب ہو کر تیار ہوا ہے اور قیمت اس کی چھ روپیہ ہے۔

ہدایت مبتدی واسطے تعلیم لڑکوں کے زبان اُردو میں تیار ہوئی ہے اور حجم اس کا ساٹھ ہے
جزو کا۔ اس میں پند و نصائح اوّل سے آخر تک بھرے ہوئے ہیں۔ خدا کی ذات سے یقین ہے کہ مبتدیوں
کو بہت مفید ہو۔ قیمت اس کی آٹھ آنہ ہے۔

اور ایک کتاب اصول شاہی بہت محشّی اور خوش خط کمال صحت کے ساتھ چھپی ہے۔ قیمت
اس کی عہر (بیس آنے) مقرر ہوئی ہے۔

جن صاحبوں کو ان کتابوں کا خرید نا منظور ہو وہ اپنی درخواست مطبع اسلام واقع
مدرسہ دہلی میں روانہ کریں فقط۔[1]

(۱۹) اشتہار (علاج الامراض و طب اکبر)

واضح ہو کہ ندرت نصاب مسمی بہ علاج الامراض تصنیف اشرف الحکما رشریف الاطبا مسیح دوراں
حکیم محمد شریف خاں مرحوم سے اس مطبع میں بہ کمال صحت اور نہایت خوش خط اور صاف و روشن
چھپ کے طیار ہوئی ہے۔ قیمت اس کی دس روپیہ ہے۔

اور کتاب طب اکبر بھی بخط خوش ولایتی کاغذ پر چھپ رہی ہے۔ چنانچہ قریب ثلث کے
چھپ چکی ہے۔ قیمت اس کی بارہ روپیہ ہے۔

جن صاحبوں کو ان کتب مفید و ضروریہ کا خرید نا منظور ہو درخواست اپنی مہتمم طبع کے پاس
بھیجیں۔ کتب مذکورہ ان کی خدمت میں پہنچیں گیں۔[2]

(۲۰) اشتہار از طرف مطبع دار العلوم

دریں ولا مولوی سید وجیہ الدین ابن مولوی سید امین الدین بن مولوی محمد حیات متوطن قصبہ جلیسر
ضلع متھرا نے بہ اعانت زبان دانان ہر علم کے ایک کتاب لغت کی کمال کوشش و جاں فشانی سے متضمن ادیہ
السنہ مختلفہ یعنی عربی، فارسی، انگریزی، بنگالی، افغانی، ترکی اور اردو کی اور تفریق بہ قیود صرف و نحو او ولہجہ
بنا ناصوائنغ ہر زبان سے بہ طریق سہل ایجاد کیا ہے کہ آج تک ابتدائے عالم سے کسی نے ایسی کتاب لغت کی ہو

---

[1] قران السعدین جلد ۳ نمبر ۱ مورخہ ۱۰ اپریل ۱۸۴۸ء [2] قران السعدین جلد ۳ نمبر ۲۴ مورخہ ۱۶ اکتوبر ۱۸۴۸ء

سب باتوں پرحاوی ہونہیں لکھی۔ الحق یہ شائقین کے واسطے ایک جام جہاں نما ہے کہ ادنی تامل سے سات زبان کے لغات پر قادر ہوسکتا ہے۔ اس واسطے اشتہار دیا جاتا ہے کہ جس کسی کو خواہش اس کتاب کی ہووے تووہ درخواست اپنی مہتمم مطبع العلوم سید اشرف علی کے پاس بھیج دیوے۔ بروقت تیار ہونے کتاب کے اس کے پاس پہنچ جاویگی اور قیمت اس کتاب کی بیس روپیہ قرار پائی ہے، کس واسطے کہ ضخامت اس کتاب کی ۔۔ جزو کی ہوگی۔ جو کوئی روپیہ پیشگی داخل کرے گا تو اُس کو اٹھارہ روپیہ کو ایک جلد ملے گی ورنہ بعد تیار ہونے کے بیس روپیہ کر دی جاوے گی۔[1]

اشتہار ایک مفید اورعجیب کتاب کا

اوپر شائقین علم تواریخ اور اہل علم کے دوست رکھنے والوں کے واضح ہو کہ ایک نئی کتاب ۔۔س عامی کی تصنیف سے طیار ہوئی ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ اس کتاب میں حالات بڑے بڑے ۔۔ا ضلوں اور حکیموں یونان مثل سقراط اور افلاطون اور لقمان وغیرہ مع تصویرات ان کے ہونگے اور حالات شہنشاہاں اور قیصران رومیہ کبریٰ کے جو کہ ایک وقت میں قریب تمام دنیا کے مالک تھے اور بہ سبب کم ہونے علم کے اور گذرنے زمانہ کے اون کے حال سے لوگ بالکل ناواقف اور غافل ہو گئے ہیں، اس کتاب مفید میں درج ہوں گے اور بڑے بڑے افسروں اور جرنلوں اور فصیحوں رومیہ کبریٰ کا بھی ذکر ہوگا اور لطف یہ ہے ان سب بزرگوں کی اکثر تصویرات بھی ہوں گی اور کتاب مذکور میں تذکرہ بڑے بڑے فاضل اور عاقل اور حکیم انگریزی کا بھی مثل سر اسحاق نیوٹن اور جناب فرینک لین وغیرہ کے مندرج ہوگا اور انشاءاللہ تعالیٰ تصویرات ان کی بھی ضرور درج ہونگی۔

واضح ہو کہ اب تک کوئی ایسی کتاب نہیں بنی ہے۔ یہ نیازمند مختلف کتب میں سے چُن کر اس کتاب کو تیار کریگا اور صفحے اس کتاب کے قریب ۲۰۰ کے ہونگے اور قیمت اسکی دو روپیہ مقرر کئے ہیں سب لوگوں پر بخوبی ظاہر ہو اور یقین جانیں کہ اتنی قیمت کم اس عاجز نے صرف بہ باعث نفع اور فائدہ عام کے اور اس سبب سے ۔قدردانان بندہ کو نیک نامی سے یاد کریں مقرر کی ہے۔ اگرچہ درخواستیں اس کتاب کی بہت آچکی ہیں تب بھی چند اور درخواستوں کی ضرورت ہے۔ امید کہ جن صاحبوں کو اس کتاب کا خرید نا منظور ہو درخواست اپنی لکھ کر بنام بندہ کے روانہ فرماویں۔ انشاءاللہ بروقت تمام طبع ہو جانے کے خریداروں کی خدمت میں ارسال کروں گا۔ فقط

الراقم رام چندر مہتمم پرچہ فوائد الناظرین[2]

---

[1] قران السعدین جلد ۳ نمبر ۳۰ مورخہ ۱۵ مئی ۱۸۴۹ء

[2] قران السعدین، جلد ۳، نمبر ۳۲ مورخہ ۲۲ اگست ۱۸۴۹ء

علمی و ادبی خبریں

(۱) مدرسہ اندور

پہلے ہم کچھ حال مدرسہ اندور کا لکھ چکے ہیں، مگر ہم کو اب فرصت ہوئی تو (اخبار) مفصلائٹ سے ہم مفصل ترجمہ کر کے لکھتے ہیں۔

ترجمہ خط (مفصلایٹ)

آج کی تاریخ یعنی سولہویں نومبر (۱۸۴۸ء) کو تین سال مدرسہ کو مقرر ہوئے گذرے ہیں۔ اور اسی روز امتحان مدرسہ درپیش ہے۔ صاحب رزیڈنٹ بہادر اور کئی صاحب اور مہاراجہ بھی جلسہ میں موجود ہیں۔ اتفاق سے میں یہاں آگیا ہوں اور یہاں کے اس حال کو دیکھ کر بہت محظوظ ہوا۔ مدرسہ میں دو سو ساٹھ لڑکے تعلیم پاتے ہیں۔ اول کی پانچ جماعتوں میں چالیس لڑکے ہیں اور انگریزی زبان کی تحصیل کرتے ہیں۔ تحریر اور جغرافیہ اور تاریخ اور جبر مقابلہ داخل کتب درس ہیں۔ واسطے حفاظت انگریزی عملداری کے بعض گو یہ کہیں گے کہ یہاں (ہندوستان میں) انگریزی بستیاں مقرر کرنی چاہئیں۔ بعض یہ رائے دیں گے کہ راہ آمدورفت کو خوب درست کرنا چاہیئے لیکن میرے نزدیک علم انگریزی کا اس مطلب کے واسطے مفید تر ہے کیونکہ اس کے باعث سے حاکم اور محکوم کی عادتیں ایک ہو جاویں گی اور وہ ہماری تدابیر کو پسند کریں گے۔ فقط

(۲) قیام چھاپاخانہ مدرسہ اندور

از روئے تحریر ایک دوست کے دریافت ہوتا ہے کہ جناب ہملٹن صاحب بہادر دام اقبال کو شیوع علوم کی طرف از حد توجہ تھی، تو ان کے استعانت سے ایک چھاپہ خانہ پتھر کا اندور میں مقرر ہوا ہے اور کتابیں شاستری چھپنی شروع ہو گئی ہیں۔ فی الحقیقت اس نواح میں اس شئے کے مقرر ہونے سے نفع کثیر متصور ہے۔ کتابیں چھپ کر سب خاص و عام کو بہت سستی

۱؎ قران السعدین جلد ۳، نمبر ۲، مورخہ ۱۰ جنوری ۱۸۴۸ء

ل اسکیں گی۔ صاحب موصوف نے پہلے تو ایک مدرسہ مقرر کر دیا ہے جس میں ساٹھ لڑکے تعلیم پاتے ہیں۔ اب یہ چھاپہ خانہ مقرر کروایا ہے ایسے ہی عالی ہمت لوگوں کے باعث سے ہندوستان میں پھر علم و ہنر کا چرچا ہو جاوے گا۔[1]

(۳) اشتہار مفید ہند۔ دہلی

اظہار خوشنودی

ہم بہت خوش ہیں اس امر سے کہ اس شہر سعادت بھر میں علم کو روز بروز ترقی ہوتی جاتی ہے اور چرچا ہنر کا روز بروز ترقی پاتا جاتا ہے۔ تھوڑے دن ہوئے کہ ہمراہ ہمارے اخبار (جلد ۳ نمبر ۱۲ ' مورخہ ۲۰ مارچ ۱۸۴۸ء) کے ایک اشتہار جاری ہونے ایک نئے اخبار موسوم بہ مفید ہند نکلا تھا۔ سو اول پرچہ اخبار مذکور کا شنبہ گذشتہ (۱۵ اپریل) کو باہتمام منشی حسینی اور پنڈت اجودھیا پرشاد کے کہ یہ دونوں صاحب مدرسہ دہلی میں اوپر علاقہ مدرسی کے مامور ہیں جاری ہوا۔ خدا ان کی کوشش کو تاج فتح کا نصیب کرے۔ کسی پرچہ میں ہم بھی واسطے ملاحظہ ناظرین اپنے اخبار کے اخبار مذکورہ میں سے کچھ نقل کریں گے۔ ابھی اتنے ہی پر قناعت کی جاتی ہے۔[2]

(۴) اشتہار تحفۃ الحدائق۔ دہلی

بالفعل بہ تجویز چند اشخاص خیر خواہان خلائق کے ایک پرچہ اخبار کا مسمی تحفۃ الحدائق بہ طرز جدید و وضع مفید کے اس چھاپہ خانہ (مطبع العلوم) میں چھپتا ہے۔ طرز اس کی یہ ہے کہ ورق اول میں بیان کلیات اور معالجات اور تشریح کا مشروحاً و مفصلاً بہ ترتیب کتب طبیہ کے، اور ورق دوئم میں تاریخ ابتدائے حضرت آدم ہے اور سوم میں قوانین اور احکامات گورنمنٹ گزٹ اور ورق چہارم میں اخبارات مقامات مختلفہ درج ہوتے ہیں۔ مہینے میں دو بار یہ پرچہ جاری ہوتا ہے اور قیمت ایک روپیہ ماہواری ہے اور مہتمم اس کے محمد جعفر علی نقی ہیں۔ جس صاحب کو خریداری اس کی منظور ہو درخواست اپنی بہ پتہ چھاپہ خانہ مدرسہ انگریزی

---

[1] قران السعدین جلد ۳ نمبر ۱۱ - مورخہ ۲۰ مارچ ۱۸۴۸ء
[2] قران السعدین جلد ۳ نمبر ۱۴ - مورخہ ۱۸ اپریل ۱۸۴۸ء

یہ مہتمم مرقومہ بالا کے پاس ارسال کریں۔ فقط[1]

(۵) آزردہ کی دو غزلیں

ان دنوں میں کئی غزلیں ایک زمین میں نظر سے گذریں اور ان کے نکات رنگین اور مضامین شیریں سے التذاذ حاصل ہوا۔ آزردہ دام اقبالہٗ کے دو غزلہ کی پاکی الفاظ اور رنگینی معنی اور خیر مئی طرز اور نمک عبارت اور حسن استعارت اور خوبی تشبیہ اور... اسلوب نے ایسی دلربائی اور جاں فزائی کی کہ بے اختیار دل نے چاہا کہ اس کو کاغذ اخبار میں لکھ کر مشتاقان سخن کی نظر سے گذرانئے افسوس کی جائے ہے کہ حضرت موصوف اکثر اپنے اوقات شریف کو حل دقائق ملیہ میں کہ مطالب شریفہ اور اہم مقاصد میں، معروف رکھتے ہیں اور علاوہ اس کے ... بعض مقدمات عدالت سے فرصت چشم زدن حاصل نہیں۔ فکر غزل اگرچہ ان کے ذہن مرتبہ ہے مہلت ہی نہیں کہ ایک لمحہ ادھر بھی التفات فرماویں۔ جائے حیرت ہے کہ ایسے افکار کے سرانجام دینے کے واسطے اپنے شریف اوقات میں سے کون سا وقت نکال لیتے ہوں گے۔ مگر کہ عطیہ ایزدی ہے کچھ فکر اور تامل کی حاجت نہیں۔ ذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء۔

غزل

ہے مفت دل کی قیمت، اگر اک نظر ملے
یہ وہ متاع ہے کہ نہ لیں مفت اگر ملے

انصاف کر کہ لاؤں میں پھر کون سا وہ دل
محشر کے روز بھی جو نہ دادِ جگر ملے

پروانہ وار ہے حد پرواز شعلہ تک
جلنے ہی کے لئے مجھے یہ بال و پر ملے

آنے سے خط کے جاتے رہے وہ بگاڑ سب
بن آئی اب تو حضرت دل کو خضر ملے

کیا شکر کا مقام ہے، مرنے کی جا ہے دل
کچھ مضطرب سے آج وہ بیرون در ملے

عالم خراب ہے نہ نکلنے سے آپ کے
نکلو تو دیکھو خاک میں کیا گھر کے گھر ملے

ہے شام ہجر آج تو او ظالم! او فلک!
گردش وہ کر کہ شام سے آ کر سحر ملے

گو یاس ہو پہ چین تو ہے اس بگاڑ میں
کیا لطف تھا لڑے وہ اُدھر اور ادھر ملے

دل نے ملا دیں خاک میں سب وضعداریاں
جوں جوں رکے وہ ملنے سے ہم بیشتر ملے

---

[1] قران السعدین جلد ۳ نمبر ۴۲۔ ۱۳ ارجون ۱۸۴۰ء

ڈھٹے یہ بخیہ زخم کا، ہمدم کہیں سے لا   خنجر ملے، کٹار ملے، نیشتر ملے
تھا اصل میں مراد ڈبونا جہان کا   قابل سمجھ کے گویہ ہمیں چشم تر ملے

اُس کی گلی میں لے گئے آزردہ کو اٹھا کے
دی تھی دعا یہ کس نے کہ جنت میں گھر ملے

غزل دوئم

ایک بات پر بگڑ گئے، نہ جو عمر بھر ملے   اوس سے طریق صلح کے کیا صلح گر ملے
باہم سلوک تھا، پہ ترے دورِ حسن میں   یہ رسم اُٹھ گئی کہ بشر سے بشر ملے
دل محو چشم یار تھا، بیمار ہو گیا   کچھ ان پرستشوں کا بھی آخر ثمر ملے
اے نالہ تو نے ساتھ دیا آہ کا تو کیا!   امید کیا اثر کی جو دو بے اثر ملے
صدمہ جگر پہ پہنچے تو ہو دل میں کیوں نہ درد   کیا فرق کچھ جدا نہیں، ہیں دل جگر ملے
ہم کو ہمارے طالع بد نے ڈبو دیا   اچھے تھے گر نصیب تو کیوں چشم تر ملے
دھوؤں صد آب تیغ سے اے پنبہ جو کبھو   دامن سے تیرے دامن داغ جگر ملے
امید بو میں اُس کی ملے یوں صبا سے ہم   جس طرح بے خبر سے کوئی بے خبر ملے
جو کچھ نہ دیکھنا تھا، سو وہ دیکھنا پڑا   اُس بیوفا سے پہلے تھے کیا نکھ کر ملے
دیکھے ہنر جو اپنے ہی، وہ جانے اُس کا کام   ہم کو تو عیب دیکھ کے اپنے ہنر ملے
مہر جہاں فروز دکھا دوں جبیں کو میں   گر سنگ آستانۂ خیر البشر ملے

ملنے سے اس کے گفتنی ہے کیا تیری شان حسن
آزردہ خستہ جان بھی ملے تو اگر ملے[1]

(۶) مولوی کریم الدین کی گلشن اردو کا اشتہار

واضح ہو کہ ان ایام میں مولوی کریم الدین صاحب نے کہ ایک مدرس اردو مدرسہ آگرہ کے ہیں ایک کتاب اردو محاورات مشکل کی جو بالفعل اردو میں رائج اور زبان زد خاص و عام ہیں مع ضرب المثال اردو کے جن کے معنی دریافت کرنے ہر شایق اُردو کو ضرور ہیں، تالیف

[1] قران السعدین جلد ۳، نمبر ۱۲ ـ ۲۰ مارچ ۱۸۴۸ء

کی ہے۔ مگر ہم وہ کتاب مدارس کے لوگوں کے حق میں بہت مفید ہوگی لیکن اکثر شائقین زبان اردو اور شعراء کو بھی بہت فائدہ پہنچے گی۔ اُس کتاب کا چھپنا اس مطبع آگرہ کالج میں شروع ہوا ہے۔ جس صاحب کو خریداری منظور ہو اپنی درخواست صاحب مہتمم صدرالاخبار کے پاس روانہ کرے۔ قیمت فی کتاب بارہ آنہ مقرر ہوئی ہے اور نام اُس کا گلشن اُردو قرار پایا ہے۔

اظہار (مہتمم قران السعدین)۔ حسب فرمایش صاحب صدرالاخبار کے یہ اشتہار درج ہوا۔ اگر مولوی کریم الدین صاحب بہ ذات خود واسطے اندراج اشتہار ہذا کے ارشاد کرتے تو بھی ہم کو کچھ عذر نہ ہوتا۔ مہتمم ق[۱]

متفرق خبریں

(۱) خبر دہلی

آج کل یہاں سردی خوب چمک رہی ہے، ایک برج جامع مسجد کا کھل گیا ہے سو اتار لیا گیا ہے، اور نئے برج کے بنانے کی تیاری درپیش ہے۔

اسباب جو والی اودھ نے گورنر جنرل کو پیش کش میں دیا تھا، دہلی میں آکر بطور نیلام فروخت ہو گیا اور خاطر خواہ دام اٹھے۔ اکثر مشتریان کی زبانی دریافت ہوا کہ انھیں آخر کو نقصان ہوا[۲]

(۲) خبر کلکتہ

یہاں کے ایک انگریزی اخبار (کے)... مہتمم... لکھتے ہیں کہ ایک خریدار نے میرا اخبار محصول ڈاک کے مارے لینا چھوڑ دیا۔ قیمت اخبار کی چونسٹھ روپے ہیں اور محصول ڈاک اٹھاون روپے۔ اس قدر محصول اخبارات پر بڑا بوجھ ہے اور موجب کمی شیوع علم کا ہوتا ہے شکایت اس کی حکام ولایت پر ہے، کیوں کہ.. گورنر بنگال اور گورنر جنرل نے تو نیا طریقہ فی اخبار ایک آنہ قرار دیا تھا اور اجازت کورٹ آف ڈائرکٹرز کی چاہی تھی لیکن صاحب ڈائرکٹر

---

[۱] قران السعدین جلد ۲ نمبر ۱۰ مورخہ ۱۸ اپریل ۱۸۴۸ء [۲] قران السعدین جلد ۳ نمبر ۲ مورخہ ۱۰ جنوری ۱۸۵۰ء

اپنی ہٹ سے باز نہیں آتے اور کوڑی بھی محصول ڈاک کی نہیں گھٹاتے۔[1]

(۳) دوندو میاں

بعض رئیسان فرید پور نے ایک عرضداشت در باب اس ہنگامہ کے جناب ڈپٹی گورنر بنگال کو پیش کی ہے۔ اس کا خلاصہ واسطے ناظرین اخبار کے درج کرتے ہیں۔

دوندو میاں نے عرصۂ قلیل سے ایک ایک لاکھ اہل اسلام کے اپنے مرید کر لئے ہیں اور یہ اور اپنے مریدوں کے ہندوؤں پر دست ظلم کا دراز کرتا ہے اور ان مسلمانوں کو بھی جو اس کے فرقے میں داخل نہیں ہوتے، تنگ کرتا ہے اور اپنے مریدوں کو یقین دلا دیا ہے کہ بموجب خواہش ربانی سے مالک تمام بنگال کا ہو جاؤں گا۔ اور ابنائے جنس میں کوئی فرق نہیں ہے یعنی سب مساوی حقوق رکھتے ہیں۔ اس واسطے کہ لوگوں کو اوس کے طریقے اختیار کرتے ہی فائدہ دنیوی حاصل ہو، اوس نے یہ اجازت دی ہے کہ وہ رسمیں جن میں روپیہ بہت خرچ ہوتا ہے، لاحاصل ہیں، بلکہ ان کی پیروی موجب گنہگاری کا ہوتی ہے ...... یہ شخص اپنے مریدوں پر بطور مجسٹریٹ حکمرانی کرتا ہے۔ ان کی فریادوں کو سنتا ہے، مقدمات فیصل کرتا ہے اور احکام دیتا ہے۔ اور جو انحراف کرتے ہیں انہیں سزا دیتا ہے اور جب ضرورت پڑتی ہے تو سب سے روپیہ لیتا ہے۔ اس کے ہمراہ ایک گرم جوش اور خوفناک گروہ ہے، جو اس کے حکم کی تعمیل کے واسطے جان دینے کو موجود ہے.....

میاں موصوف اپنے تئیں گورنر جنرل تصور کرتے ہیں اور انھوں نے اپنی طرف سے عہدہ دار واسطے امور ملکی و مذہبی وغیرہ کے مختلف اضلاع میں مقرر کئے ہیں۔[2]

(۴) سید احمد خاں کے فیصلے کی تعریف

انصاف

ہم بہت خوش ہیں اظہار اس امر سے کہ عدل و انصاف ہمارے شہر کی عدالتوں میں بخوبی ہوتا ہے۔ حکام متخاصمین میں سے کسی کی رو و رعایت نہیں کرتے جس کا حق ہوتا ہے اوسی کو دیا جاتا ہے۔ صاحب سشن جج دہلی اور صاحب مجسٹریٹ دونو ان باتوں کے واسطے مشہور ہیں۔ ان صاحبوں کے روبرو کسی اہلکار کی نہیں چلتی، اور مظلوم داد کو پہنچتا ہے۔ مگر خوشی کی یہ بات ہے کہ

---

[1] قران السعدین جلد ۱۰ نمبر ۳ صفحہ ۰ ۱ جنوری ۱۸۵۰ء [2] قران السعدین جلد ۳ نمبر ۵ صفحہ یکم فروری ۱۸۵۰ء

حکام ہندوستانی میں سے بھی ایسے آدمی پائے جاتے ہیں جو نازک مقدمات میں بھی کسی کے رو و رعایت نہیں کرتے۔ چناں چہ ان دنوں زبانی ایک خبر رساں کے دریافت ہوا کہ ایک مقدمہ بابت قبضہ ایک چاہ کہنہ خام کے جو قریب درگاہ حضرت نصیر الدین چراغ دہلی قدس سرہ کے واقع ہے عدالت میں منصف دویم سید احمد خاں بہادر کے دائر ہوا۔ واضح ہو کہ مدت سے یہ مقام زیارت گاہ اہل اسلام ہے۔ لوگوں کو یہ اعتقاد ہے کہ ایک دفعہ حضرت نصیر الدین یہاں تشریف لائے تھے اور پانی میسر نہ آیا کہ وضو کر کر نماز ادا کرتے۔ انھوں نے زمین پر انگلی ماری۔ ناگاہ ایک چشمہ پیدا ہو گیا۔ اب یوں مشہور ہے کہ اگر کوئی بیمار اس کنوئیں کے پانی میں غسل کرے فوراً شفا پاوے اور عورت عقیمہ اس کے غسل سے حاملہ ہو جاوے۔ اس واسطے ایک فصل معین میں مردم اطراف و جوانب وہاں آکر جمع ہوتے ہیں، اور چڑھاوا چڑھاتے ہیں۔ یہ سب چڑھاوا حضرت موصوف کی درگاہ کے مجاور لیتے ہیں اب کی وہاں کی سرزمین کے زمینداروں نے، کہ ہندو ہیں، اوس زمین کا دعوی کیا اور مجاوروں کو وہاں سے بیٹھنے دیا۔ انھوں نے عدالت مذکور میں استغاثہ کیا۔ حاکم عدالت کے نزدیک کہ انھوں نے پاس قومیت اور مذہب کا نہ کیا، حق ہندوؤں کا ثابت ہوا اور اسی لئے انھوں نے انھیں بخوبی دخل دلوا دیا اور حق حقدار کا غصب نہ کیا۔

اسی طرح کے مقدمات کے تصفیہ سے درحقیقت حاکم کا میل طبیعت طرف دوستی عدل کے معلوم ہوتا ہے، کیوں کہ جب متخاصمین سے ایک، تو حاکم کی ملت کے موافق ہو اور دوسرا مخالف، تو خدا نخواستہ جس کو خوف خدا نہ ہوگا، پاس مذہب کر جائے گا۔ مگر جو طریق انصاف میں ثابت قدم اور صادق دم ہوگا، وہ ضرور عدل کرے گا، اور فیصلہ مقدمات میں تعصب کو ہرگز دخل نہ دے گا۔ اکثروں کو ہم نے اس حاکم (سید احمد خاں) کے فیصلجات (فیصلہ جات) سے راضی پایا اور یہی اون کے منصف ہونے پر دلالت کرتا ہے[1]

(۵) انقلاب فرانس کے اثرات

فرنگستان

پیرس دار الخلافہ فرانس میں بعد مقرر ہونے ریاست جمہور کے امن و امان ہو گیا تھا حکام

---

[1] قران السعدین، جلد ۳ نمبر ۶ موٴرخہ ۴ مر اپریل ۱۸۴۸ء

اشتہار جاری کیا کہ ہم طالب امن ہیں، اور آزادی چاہنے والوں کے معاون۔ اس اشتہار کے جاری ہونے سے سارے فرنگستان میں ایک قسم کی کھل بلی پڑ گئی ہے۔ بادشاہ پروشیا نے اپنے رسول (سفیر) کو جو دربار پیرس میں رہا کرتا تھا واپس بلا لیا ہے۔ ملک سوت زرلینڈ (سوئٹزرلینڈ) میں ایک قوم نے بادشاہ پروشیا سے برگشتہ ہو کر نئی ریاست مقرر کر لی ہے۔ شہنشاہ اور والدہ ملک اسپین کے انقلاب پیرس کا حال سن کر بیمار ہو گئے۔ جرمنی میں اندھیر ہو رہا ہے۔ ڈیوک ہس کیل کا خاتمہ از ریاست کیا گیا۔ استریا میں لوگ فساد کے جوش میں آ رہے ہیں۔[1]

وزیر اعظم اسٹریا کی درگت

سب کو یہ توقع تھی کہ اگرچہ بعض بلاد میں فرنگستان کے لوگ آزادی کے واسطے کوشش کرتے تھے لیکن آٹھ دس برس تک اسٹریا میں حکمرانی شہنشاہ کی جاری رہے گی اور وہاں کے آدمی گورنمنٹ کو نہ الٹیں گے، لیکن ناظرین پر ظاہر ہو کہ وہاں بھی فتنہ و فساد ظاہر ہوا اور نوبت جنگ و جدل کی پہنچی۔ جانبین سے آدمی تلف ہوئے، اور لوگوں کو آزادی حاصل ہوئی۔ مسٹر نخ وزیر اعظم کہ وہ حامی اور معاون حکومت شخصی کا تھا وزارت سے دست بردار ہو کر بھاگ گیا۔ سرکشوں نے اوس کے مکان کو پائمال کیا اور اکثروں نے اس کے مکان کے آگے پھانسی کی لکڑیاں کھڑی کیں اور وزیر موصوف کا بت بنا کے اور ہزارہا گالیاں دے کے دار پر چڑھایا۔

ایک ضمیمہ مختصر دہلی گزٹ سے دریافت ہوا کہ دار الخلافہ آسٹریا میں بخوبی آگ فتنہ و فساد کی بھڑک رہی ہے، بادشاہ تخت سے اتار دیئے گئے، ریاست جمہور کی مقرر ہوئی ہے (یہ) منادی سب ملک میں پھر گئی اور بادشاہ مع اپنے وزرا کے محبوس ہے۔ دیکھئے اُن کے حق میں کیا ہوتا ہے۔[2]

فرنگستان

فرانس میں بہت بڑی سرکشی اور فتنہ اس قدر برپا ہو رہا ہے کہ وہاں کے حکام جمہوری ریاست کے اپنے عہدے سے دست بردار ہو گئے ہیں اور دار الخلافہ پیرس کا محاصرہ ہو رہا ہے۔ وہاں کے کاری گروں نے نائرہ سرکشی کا بلند کیا ہے۔ اس باعث سے بہت سے آدمی زخمی ہوئے اور

---

۱ قران السعدین جلد ۳ نمبر ۱۹ یکم مئی ۱۸۴۸ء

چند آدمی مارے گئے لیکن فوج نے ان کے حملے کو دفع کر دیا۔ تمام فرنگستان میں بڑی بے انتظامی اور فساد ہو رہا ہے۔

ملک پروشیا کا بھی یہی حال ہو رہا ہے۔ برلن میں جو اس کا دار الخلافہ ہے بڑا ہجوم اور قتل واقع ہوا ہے۔ آسٹریا میں بھی فساد کی ترقی ہو رہی ہے۔ بادشاہ کی فوج نے دار الخلافہ کا محاصرہ کیا ہے۔ روس کے ملک میں تین چار فوج آراستہ کی جاتی ہے۔[1]

(۶) سول اور فوجی افسروں کی تنخواہیں

اظہار

چوں کہ اس ہفتہ میں کئی صاحبوں نے ہم سے استفسارات مواجب صاحبان اہل سیف و قلم (سول اور ملٹری) کا کیا ہے، اس واسطے ہم اصول قوانین مال میں سے جن کو جناب بوٹروس صاحب پرنسپل مدرسہ دہلی نے ترتیب دیا ہے، فہرست ذیل نقل کرتے ہیں۔ چوں کہ جاننا اس امر کا سب کو ضروریات سے ہے اس واسطے ہمیں امید ہے کہ جمیع ناظرین اس فہرست کو بہ رغبت مطالعہ فرما دیں گے۔ کچھ عجب نہیں کہ اس فہرست میں کچھ غلطی بھی ہو، لیکن وہ غلطی جزوی ہو گی اور اس سے چنداں ہرج بھی نہیں ہے فقط۔

اہل قلم

تنخواہ داروغہ تھانہ	۲۵ روپے
خزانچی عدالت صاحب کلکٹر	۴۰ سے ۵۰ تک
سررشتہ دار	۴۰ سے ۱۰۰ تک
منصف	۱۰۰ سے ۱۵۰ تک
ڈپٹی کلکٹر	۲۰۰ سے ۶۵۰ تک
تنخواہ صدر امین	۱۵۰
صدر الصدور	۴۰۰ سے ۶۰۰ تک
اسسٹنٹ معتمد	۴۰۰ سے ۷۰۰ تک

---

[1] قران السعدین جلد ۳ نمبر ۳۳ مورخہ ۱۲ اگست ۱۸۴۸ء

صاحب کلکٹر اضلاع بنگال و اُڑیسہ وغیرہ	۱۹۲۷ روپیہ
صاحب کلکٹر اضلاع شمال و جہاں وہ صاحب مجسٹریٹی کا کام بھی کرتے ہیں	۲۲۷۰
صاحب جج	۲۵۰۰
تنخواہ صاحب کمشنر کی مع سفر خرچ کے، قریب	۳۲۰۰
تنخواہ سکتر گورنمنٹ بنگال	۳۰۰۰
صاحب رزیڈنٹ جو کسی ریاست میں مقیم ہوئے	۲۰۰۰ سے ۵۰۰۰
ممبر صدر بورڈ یا صدر دیوانی عدالت کے	۴۳۵۰
پرائیوٹ سکتر گورنر جنرل	۳۰۰۰
سکتر مطلق گورنمنٹ	۴۳۵۰
ممبر کونسل	۸۳۶۰
لفٹنٹ گورنر آگرہ	۱۲۷۵۰
گورنر جنرل	۲۰۹۰۰

اہل سیف

جمعدار سپاہیوں کا ماہیانہ	۲۴
صوبہ دار	۷۸
صوبہ دار میجر کو	۹۲
اِنسائین	۲۰۲
لفٹنٹ	۲۵۶
کپتان	۴۱۵
میجر	۷۵۹
لفٹنٹ کرنل کو	۱۰۰۲
بریگیڈیر کو	۲۵۰۰ سے ۳۰۰۰
جنرل کو	۴۰۰۰ سے ۵۰۰۰
کمانڈر انچیف	۱۵۰۰۰

اضلاع شمالی و مغربی میں بعض ڈپٹی کلکٹروں کو ۰۰ے روپیہ ماہیانہ ملتا ہے لیکن بنگالہ اور بہار میں غالب ہے کہ کسی کو بھی ۵۰۰ سے زیادہ تنخواہ نہیں ملتی۔[1]

(۷) اندھوں کے پڑھنے کا اسکول

ولایت کے کسی اخبار سے معلوم ہوا کہ وہاں اندھے بھی علم سے بے نصیب نہیں رہتے۔ ایسے لڑکوں کے پڑھنے کے واسطے وہاں ایک بھاری اسکول بنا ہے۔ لوگ متعجب ہو کے پوچھیں گے کہ اندھے کتابوں کو کیوں کر پڑھیں گے اور وہ حرفوں کو کیوں کر پہچانیں گے لیکن واضح ہو کہ وہاں اندھوں کو پڑھانے کے واسطے ایک نئی ترکیب کتابوں کے تیار کرنے کی نکالی گئی ہے اور وہ یہ ہے کہ حرف کتاب کے اونچے اور ابھرے رہتے ہیں۔ اندھے ہاتھ سے حرفوں کو چھوتے ہیں اور ربط ہو جانے سے مضمون کتاب کا بہ آسانی پڑھ لیتے ہیں (تبصرہ مہتمم تعلیم الخلایق) بہت افسوس کی بات ہے کہ ولایت میں تو اندھے بھی علم سے بے بہرہ نہیں رہتے۔ مگر ہمارے ملک میں اکثر آنکھوں والے دیدہ و دانستہ آنکھ بند کر لیتے ہیں اور علم نہیں سیکھتے۔

بہ طور اختصار از تعلیم الخلایق۔[2]

---

[1] قرآن السعدین جلد ۳ نمبر ۱۳، مورخہ ۱۳ جولائی ۱۸۴۸ء

[2] قران السعدین جلد ۳ نمبر ۲۳، مورخہ ۲۲ اگست ۱۸۴۸ء

ڈاکٹر خورشید الاسلام

پردیسی کے خطوط

(ایک مطالعہ)

گذشتہ تیرہ چودہ سال کے اندر مجنوں گورکھپوری نے جو کچھ لکھا ہے اس کا بیشتر حصہ ان مکاتیب کی شکل میں ہے جن کو وہ "پردیسی کے خطوط" کا عنوان دیتے رہے ہیں اور جو پہلے اخبار و رسائل میں اور بعد کو دو جلدوں میں شائع ہوئے ہیں۔ "پردیسی کے خطوط" کا پہلا سلسلہ ... صورت میں اب سے چار سال پہلے شائع ہوا تھا جن میں زندگی اور ادب کے بعض مسائل پر مصنف نے اپنے خیالات پیش کئے تھے۔ یہ جلد اس وقت میرے پاس نہیں ہے۔ ابھی حال میں مکتبۂ جامعہ دہلی نے "پردیسی کے خطوط" کا دوسرا سلسلہ شائع کیا ہے، وہ میرے سامنے ہے اور اس پر میں اپنے خیالات کا اظہار کرنا چاہتا ہوں۔

"پردیسی کے خطوط" دراصل منتشر مراقبات ہیں۔ مجنوں چاہتے تو ان میں سے ہر ایک کو ایک منظم اور مربوط شکل میں پیش کر سکتے تھے لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ بیدل، شیلی، بورس پاسترناک اور لفظ "مہربان" پر تحقیق اور تنقید کا حق ادا کر دینے کے باوجود انھوں نے کسی ذہنی مجبوری کے باعث انھیں مکاتیب ہی کا روپ اور عنوان دینا مناسب سمجھا اور پھر یہ مکاتیب یاسمین کے نام منسوب کر دئے۔

یہ خطوط ایک ایسے شخص نے لکھے ہیں جس نے تنقید سے پہلے افسانہ لکھا اور تحقیق سے پہلے شاعری کی۔ مجنوں کے اندر آج بھی تخلیقی اور تنقیدی دونوں رگیں زندہ اور کارفرما ہیں۔ وہ خود تخیل اور تعقل، وجدان اور منطقی قیاس، شعر اور حکمت، افسانہ اور فلسفیانہ حقیقت، تخلیق اور تنقید کے درمیان کوئی اساسی فرق محسوس نہیں کرتے۔ اور شاید وہ بہ قول خود "پردیسی کے خطوط" لکھتے وقت اپنی اس افسانوی یا رومانی رگ کو بھی آسودہ کرنا چاہتے تھے جو منطقی یا تنقیدی رگ کے ساتھ لڑکپن سے ان کے اندر کام کر رہی ہے۔ ان کو یہ آسودگی واقعی حاصل ہوئی یا نہیں؟ اس سوال سے ہم کو کوئی

واسطہ نہیں لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ان خطوط کو پڑھنے والا یاسمین کی شخصیت کو نہیں دیکھ پاتا۔ وہ ایک فرد کی حیثیت سے دل کی آنکھ کے سامنے نہیں آتی۔ وہ ایک استعارہ ہو سکتی ہے۔ وہ ایک سہارا یقیناً ہے لیکن وہ کوئی ایسی ہستی نہیں معلوم ہوتی جس کا تصور مجنوں کے ذہن میں کام کر رہا ہو، ان کی قوتِ متخیلہ کو گدگداتا ہو اور ان کے احساسات کو تیز کرتا ہو۔ یاسمین کے بارے میں کوئی پڑھنے والا یہ نہیں کہہ سکتا:

دیدار می نمائی و پرہیز می کنی
بازارِ خویش و آتش ماتیز می کنی

ان مکاتیب کے اندازِ تحریر اور ان کی تہوں کو دیکھنے کے بعد ان کی موجودہ شکل کے بارے میں اس سے زیادہ نہیں کہا جا سکتا کہ مجنوں نے اپنی افسردگی کو عمل میں تبدیل کرنے کے لئے، تھکن کے لمحوں کو تخلیق کی خوشی میں ڈھالنے کے لئے اور ان موضوعات پر بہت کچھ لکھنے کی حسرت کے مطالبہ کو کسی حد تک ادا کر دینے کی خاطر یہ مکاتیب لکھے ہیں۔ یہ اچھا ہوا کہ انھوں نے نقاد کا زرہ بکتر اتار کر پھینک دیا، اور حریف سے میدانِ جنگ مانگنے کے بجائے آپس کی بات چیت کا انداز اختیار کیا یعنی ان کے اعصاب آسودہ رہے۔ وہ سامعین کی سطح ذہن کی نظر سے محفوظ رہے۔ اگر وہ خوش دل تھے تو ان کی خوش دلی، اگر وہ رنجیدہ تھے تو ان کا رنج، اگر وہ برہم تھے تو ان کی برہمی، اگر وہ پر دازپر مائل تھے تو ان کی پرواز، اگر وہ لکنت پر مجبور تھے تو ان کی لکنت میں کوئی تکلف، کوئی حجاب، کوئی خطرہ مانع نہیں ہوا۔ جو کچھ انھوں نے سوچا تھا صرف اسی کا اظہار نہیں ہوا، بلکہ وہ لکھتے وقت جو کچھ سوچ رہے تھے اور اپنے سوچنے کے بارے میں جو کچھ محسوس کر رہے تھے وہ بھی ظاہر ہو گیا۔ یہ لغزیدہ خرامی، یہ زانستہ بہ راہ روی ایک دلچسپ اور بلیغ فریب ہے۔ پڑھنے والا یاسمین اور یاسمین نہیں تو مجنوں کا جیتا جاگتا شاگرد بن جاتا ہے۔ وہ ان کی رفاقت کرتا ہے اور ان کا احترام ملحوظ رکھتا ہے یعنی جو کچھ وہ کہتے ہیں اسے جذب کرتا جاتا ہے اور کسی مقام پر انھیں ٹوکتا نہیں۔ دوران گفتگو میں جملہائے معترضہ آتے ہیں۔ دوسروں کی شکایت بھی ہو جاتی ہے، زمانہ پر تیکھی ترچھی نگاہ بھی پڑ جاتی ہے، کوئی شعر یاد آ گیا تو وہ بھی صرفِ خوش دلی ہو جاتا ہے اور ان سب کے پردے میں اکبر آزمائش میں پڑ جاتے ہیں، موتی اور شعیب سے ملاقات ہو جاتی ہے، شاد عظیم آبادی کی غزل پر تبصرہ ہو جاتا ہے۔ بورس پاسترناک کے لئے میزانِ عدل قائم ہو جاتی ہے، بیدل کے شعری کارنامہ کا احاطہ ہو جاتا ہے اور شبلی شہری اور شاعر دونوں حیثیتوں سے معرضِ بحث میں آ جاتا ہے۔

"ہمدیسی کے خطوط" میں کس قدر تنوع ہے! مجنوں کا وسیع مطالعہ اور وسیع تر دلچسپیاں بڑے دل نشیں انداز میں پڑھنے والے کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہیں۔ کئی زبانوں اور تہذیبوں سے ایسی محبت اور ان کی ایسی بصیرت پڑھنے والے کے دل و دماغ کو تازگی بخشتی ہے اور اس کے ذہنی افق اور جذباتی حدود کو وسیع کر دیتی ہے۔

موضوعات کے انتخاب میں ایک اور محرک بھی نظر آتا ہے۔ مکتوب نگار کی خواہش یہ ہے کہ جو بے سبب رسوا کئے گئے ہیں ان کی نیکی اور بزرگی کو قائم کیا جائے، جو نظر انداز کئے گئے ہیں ان کو نمایاں کیا جائے، جنھیں حالات نے کسی محدود حلقہ میں ارشاد کی مسند پر بٹھا دیا ہے انھیں وہاں سے اتار کر آدمیوں کی صحبت میں لا بٹھایا جائے۔ ان مکاتیب میں بے لوثی، ہمدردی اور انصاف کے جوہر ہر جگہ نمایاں ہیں۔ ان میں وہ غیر ادبی خطوط بھی توجہ کے لائق ہیں جن کا تعلق ان روایات سے ہے جو بنی اسرائیل سے مسلمانوں تک پہنچی ہیں۔ ان روایات کو ہمارے دور کے مصلحین غیر اسلامی بتا کر کیا خدمت انجام دیتے ہیں اور کس طرح اس سرمایہ کو جو اسلام اور اسرائیلیات میں مشترک ہے غیر اسلامی قرار دے کر مذہب کو "خالص" بنانے کی سعی کرتے ہیں۔ اس بحث کو مجنوں نے بڑی خوبی سے اٹھایا ہے۔ ان خطوط میں معلومات کی وسعت اور منطق کے زور کے علاوہ طنز کی کیفیت بھی پیدا ہو گئی ہے۔ ہمارے زمانے میں اس قسم کے موضوعات سے اس قدر بے نیازی برتی جا رہی ہے کہ اس کا لازمی نتیجہ ذہنی افلاس ہے۔ وہ شخص جو ادب کو جانتے ہوئے اپنے ماضی سے ناآشنا ہو ادب کا پنساری تو ہو سکتا ہے اس کا پارکھ نہیں ہو سکتا۔

ان خطوط کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ مجنوں نے ان میں سے ہر ایک میں چاہے کوئی نئی بات نہ کہی ہو لیکن بنیادی باتیں ضرور کہی ہیں۔ جو فکر انگیز ہونے کے علاوہ ہنگامہ خیز بھی ثابت ہوئی ہیں۔ مثلاً اکبر کے سلسلہ میں انھوں نے یہ کہا ہے کہ "میں نے طنز و مضحکات کو ہمیشہ ادنیٰ درجہ کی تخلیقات سمجھا۔ اس میدان میں میں صرف ایک شخص کا قائل ہوں اور وہ انگریزی کا آئرستانی انشا پرداز سوفٹ ہے۔" اس قول سے ممکن ہے بعض لوگوں کو علی وجہ البصیرت اختلاف ہو لیکن شواہد کی بنا پر اس کی تردید مشکل ہے۔ شاد کے بارے میں یہ معنی خیز جملہ کہ "شاد عظیم آبادی نم آلودگیوں کا شاعر ہے" کامیاب اظہار کی بڑی اچھی مثال ہے۔ شاد پر ان کی یہ رائے بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ "شاد کے ہاں روایتی اور رسمی

سب کچھ ملے گا بجز انسانی مادرائیت نہیں ملے گی۔" بیدل کے بارے میں یہ جملہ قابل توجہ ہے کہ "بیدل بڑا صوفی عارف تھا"۔ شیلی کے بارے میں مجنوں کے یہ چند جملے کافی ہیں:

"شیلی ایک ایسے مستقبل کا انسان اور شاعر تھا جو ابھی نہ جانے کب تک نہیں آئے گا اور معلوم نہیں آئے گا بھی یا نہیں۔ شیلی کی خطا اور اس کے المیہ کی اصلیت یہ ہے کہ وہ دوسروں مثلاً اپنے مرشد اور خسر گوڈون (Godwin) کی طرح اس مستقبل کا صرف پیغام دے کر نہیں رہ گیا بلکہ اس مستقبل کو تنہا اپنی ذات سے زبردستی حال میں منتقل کرنے کی کوشش کی جو ایک امر محال تھا نتیجہ ظاہر تھا وہ خود اسی کشاکش میں ہلاک ہو گیا اور کوئی اس کا ساتھ دینے والا نہیں نکلا۔"

شیلی کے سلسلہ میں مجنوں کلاسیکیت اور رومانیت پر جو لکھ گئے ہیں وہ مختصر ہوتے ہوئے بھی جامع ہے اور اردو تنقید میں قابل قدر اضافہ ہے۔

ان خطوط میں بورس پاسترناک والا خط ایک خاص قدر و قیمت کی چیز ہے۔ پاسترناک روس کا مشہور شاعر تھا۔ روس میں اس کو پشکن اور لیرمنتوف کا ہمسر خیال کیا جاتا تھا اور اس کے شعری کارناموں سے یورپ اچھی طرح واقف تھا لیکن نوبل پرائز تقسیم کرنے والوں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔ اپنی عمر کے آخری سالوں میں اس نے ایک ناول لکھا جس کا نام "ڈاکٹر ژیواگو" ہے۔ اس ناول میں اس نے اپنے ملک کے نظام پر جلی کٹی تنقید کی ہے۔ یہ ناول اٹلی میں چھپا اور چند مہینوں کے اندر اندر تقریباً ساری مغربی زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو گیا اور لاکھوں کی تعداد میں بکا۔ نوبل پرائز تقسیم کرنے والوں کے دل رقیق ہو گئے اور انھوں نے پاسترناک کو اس انعام سے سرفراز کر دیا۔ اب یہ کون بتائے کہ یہ انعام ادبی تخلیق پر دیا گیا تھا یا سیاسی تنقید پر۔ مجرم ضمیر کو مطمئن کرنے کے لئے یورپ کے بعض کرم خوردہ نقادوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ یہ ناول ٹالسٹائے کے ناول "جنگ اور امن" کی ٹکر کا ہے۔ جو لوگ ادب سے آشنا ہیں اور عملی سیاست کی بھول بھلیوں سے دور ہیں وہ بلا تامل یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس کا دعویٰ ادبی ضمیر کو بیچنا ہے، بلکہ اس سے بھی کچھ بدتر۔ اس کا نوبل پرائز ان کو دیا جاتا ہے جو قوموں کو غلام بنانے کی سازشوں میں عمر گذار چکے ہیں، اور ادب کا انعام انھیں ملتا ہے جو اپنے جھوٹ کو تاریخی صداقت اور تاریخی صداقت کو ناسور گردانتے ہیں۔ "ڈاکٹر ژیواگو" کو دنیا کے بہترین ناولوں کے مقابلہ میں سوم درجہ کا ناول پاتا ہوں اور خود اس دور کے کئی روسی ناولوں کو دنیا کے بہترین ادب!

شمار کرتا ہوں۔ شولوخوف، فیدین اور الیکسی ٹالسٹائے ناول کے میدان میں پاسترناک پر وہی فضیلت رکھتے ہیں جو پاسترناک شعری وادی میں ان مصنفین پر رکھتا ہے لیکن دنیا کی ایک حقیقت وہ ستم ظریفی بھی ہے جس کو حسرت نے معصومیت کے ساتھ یوں بیان کردیا ہے:

خرد کا نام جنوں پڑ گیا جنوں کا خرد   جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

اس کی تشریح آپ کو "سفر نامۂ گو بیور" میں ملے گی جو ہماری تہذیب اور تاریخ پر تبصرہ ہے اور جس میں تمام انسانی قدریں اور نسبتیں الٹی پلٹی نظر آتی ہیں۔

بورس پاسترناک کے سلسلہ میں مجنوں نے جو کچھ کہا ہے اس کے چند اقتباسات دیکھئے:

"پاسترناک در اصل شاعر تھا۔ اس کے مزاج میں تغزل ہے۔ وہ نثر میں بھی شاعری ہی کرتا ہے وہ زیادہ سے زیادہ ایسے چھوٹے افسانے لکھ سکتا تھا جس میں اس کے شاعرانہ تخیل اور شاعرانہ اسلوب کی کھپت ہو سکے۔ پانچ سو صفحات کا ناول لکھ ڈالنا اس کا فن نہیں۔"

"ڈاکٹر ژیواگو ایک منفی انداز کی تنقید ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی اپنی ذاتی آزردگی اور مایوسی کا اظہار ضرورت سے زیادہ ذاتی تیوروں کے ساتھ کرتا چلا جا رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ پاسترناک نے خواہ مخواہ یہ ناول لکھ کر آخری عمر میں خود کو اپنے مرتبہ سے گرا دیا۔ اگر اس کو انقلاب سے شکایت بھی تو اس کا فرض تھا کہ دیانت داری کے ساتھ اپنی رائے دیتا...... اس نے ایسا نہیں کیا اور اپنے وطن، اس کے نئے نظام، اس کے نئے تجربہ کی خامیاں بتا کر رہ گیا۔"

"اس ناول کا مرکزی کردار ژیواگو ہے جو یقیناً پاسترناک کا ہمزاد ہے...... ژیواگو جانتا ہے کہ قدیم نظام معاشرت جھٹکے چاہتا ہے اور ایسے انقلاب کی فوری اور سخت ضرورت ہے جو زمین و آسمان کو بدل کر رکھ دے لیکن ژیواگو انقلاب سے ڈرتا بھی ہے۔"

"میں کھرے شخصی کردار کی اہمیت کا قائل ہوں لیکن تنہا اپنی ذات کو کائنات کا مرکز سمجھنے کو بڑی رکیک بات سمجھتا ہوں۔ ژیواگو اسی قسم کا آدمی ہے۔"

"پاسترناک بڑی نکیلی اور تہ گیر قوت متخیلہ کا مالک ہے...... لیکن اس کی انفرادیت خارج المرکز ہو کر رہ گئی ہے۔ اس کی انفرادیت اس کے لئے ایک پرانا مرض بن گئی...... ڈاکٹر ژیواگو بیک وقت پاسترناک کی تخلیقی عظمت اور اس کے شخصی مزاج و کردار کے

مریضانہ میلان کا عبرت ناک ثبوت ہے۔"

"پاسترناک نے اس ناول میں اپنے ملک اور اس کے نئے نظام کی بڑی حق تلفی کی ہے۔ اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اس نے اپنے ناول کو ۱۹۳۰ء پر ختم کر دیا ہے۔ ۱۹۳۰ء کے بعد تیس سال کے اندر روس نے کیا کیا اس کا کوئی ذکر نہیں۔ یہ کھلی ہوئی بدنیتی اور بے ایمانی ہے۔ تیرہ سال تک جو ہنگامہ گیر و دار رہا، جو غارت گریاں ہوئیں اور خاندانوں اور افراد کو جن آزمائشوں اور خطروں اور ہلاکتوں سے گذرنا پڑا اس کی تو ایک پوری مہابھارت لکھ ڈالی اور اس کے بعد تیس سال تک کیا ہوتا رہا اور روس نے کیا کیا اس کا کوئی ذکر نہیں۔ پانچ سو صفحات کی ایک پوری داستان میں چند صفحوں کا تتمہ لکھنے سے کفارہ نہیں ہو سکتا۔ یہ تتمہ پاسترناک کے چور ضمیر کی آواز معلوم ہوتا ہے۔"

بورس پاسترناک پر شاید ہی اس سے زیادہ سلجھا ہوا، اس سے زیادہ مدلل اور استوار مضمون لکھا گیا ہو۔ مجنوں نے اس ناول کا تجزیہ بڑے سلیقے سے کیا ہے۔ اس کا تعلق پاسترناک کی شخصیت سے کیا ہے؟ یہ حقیقت کے کس پہلو سے متعلق ہے؟ یہ کس زمانہ کی تصویر ہے؟ اس زمانہ کی تصویریں دوسرے ناول نگاروں کے یہاں اس سے زیادہ سچی، زیادہ بلیغ، زیادہ خوب صورت ہیں یا کم؟ پاسترناک اور ژیواگو کا المیہ کیا ہے؟ ان میں سے کوئی سوال چھوڑا نہیں گیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ژیواگو کا فنی تجزیہ کچھ اور تفصیل چاہتا تھا لیکن ظاہر ہے کہ مجنوں کوئی مقالہ نہیں لکھ رہے تھے، اور مکتوب میں شاید اس سے زیادہ کی گنجائش نہیں تھی۔ بہرحال یہ ایک خطرناک اور پیچیدہ موضوع تھا۔ اس میں ایمان اور انصاف دونوں کی آزمائش تھی۔ مجنوں اس فرض سے کس اطمینان قلب اور کس اعتماد نفس کے ساتھ عہدہ برآ ہوئے ہیں۔ اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو فن اور معاشرت کے انداز قدر کو پہچانتے ہیں، جو آدمی پر ایمان رکھتے ہیں، لیکن کبھی کبھی اپنے ایمان کو شک کی نگاہ سے بھی دیکھ لینے پر آمادہ یا مجبور ہو جاتے ہیں۔

حسرت کی دُو غزلیں

"ریاض خلیل" نام کا ایک گلدستہ اکتوبر ۱۸۹۶ء میں مارہرہ سے جاری ہوا تھا،
جس کے مالک و مرتب جناب حافظ حاجی سید علی احسن صاحب احسن تھے۔ اس گلدستہ
میں شائع ہونے والے شعرا میں داغ دہلوی اور مضطر خیرآبادی کے نام سرِفہرست ہیں۔
اس گلدستہ کے اکتوبر اور دسمبر ۱۸۹۰ء کے نمبروں میں حسرت کی دو غزلیں شائع ہوئی ہیں۔

(۱)

ہے بیماری الفت نہ ہوگی یہ کبھی اچھی
طبیبو جاؤ بھی اب ہو چکی حالت مری اچھی

، افکار عالم کیا خود اپنی بھی نہیں پروا
سراپا فکر ہونے سے ہے از خود رفتگی اچھی

ِ ترکِ مے اور موسمِ گل یہ نہیں ممکن
شرابِ ناب سے توبہ کی واعظ نے کہی اچھی

کلبے کو یوں ہوتا کسی کی بزمِ عالی میں
فدایش آرزوئے من مجھے ہے بے خودی اچھی

ے چھیڑنے کو غیر سے سرگوشیاں کیوں ہیں
نہیں معلوم ہوتی ہم کو ایسی دل لگی اچھی

ِ یا چشم مخمورِ صنم جس سے کہ پیدا ہو؟
ہزاروں ہوش سے بے شک ہے ایسی بے خودی اچھی

بب زاہد و وقت عبادت باغ جنت ہو
ہمیں ہے جنت الفردوس سے اس کی گلی اچھی

دلِ دلدادۂ صورت پرستی بھی عجب شے ہے
نہیں قابو میں رہتا دیکھ کر صورت کوئی اچھی
ستم اُن کا کرم مجھ کو جفا ان کی وفا مجھ کو
حقیقت میں ہے حسرت خوئے ایذا دوستی اچھی

(۲)

مچی ہے حسرتوں میں دھوم کس کا تیر آیا ہے
دلِ پُر آرزو میں آج شورِ مرحبا کیوں ہے
یہ کس کی شوخیِ رفتار نے فتنے اٹھائے ہیں
ابھی گزرا ادھر سے کون یہ آفت بپا کیوں ہے
مداوائے جنونِ عشق کو یہ کون آیا ہے
دلِ دلدادۂ دیوانگی وقفِ دعا کیوں ہے
شکر رنجی کا باعث کچھ نہیں پر شور سنتا ہوں
الٰہی کیا سبب ہے مجھ سے وہ بُت بے مزا کیوں ہے
شریکِ لذّتِ غم غیر کو بھی کر دیا کس نے
کسی سے بر سرِ شکوہ دلِ رشک آشنا کیوں ہے
تمہارے لب پہ کہتے ہیں تمہارے حسنِ زیبا سے
کوئی عیسیٰ نفس کیوں ہے کوئی یوسف لقا کیوں ہے
زہے قسمت سُنا ہے نام کس کا آج کانوں نے
زباں پر میری حسرت کلمۂ صلِّ علیٰ کیوں ہے

(مرسلہ عبدالقوی دسنوی مقتبس از ہماری زبان)

ڈاکٹر خلیق انجم

صفا لکھنوی

صفا لکھنوی کا پورا نام سید ذوالفقار علی خاں الحسینی اور تخلص صفا تھا[۱]۔ لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ صاحبِ محبوب الزمن نے انھیں شاگردِ میر تقی میر لکھا ہے۔ خود صفا کے دیوان سے بھی اس کی شہادت ملتی ہے کہ وہ میر کے شاگرد تھے یا کم از کم انھیں میر سے بہت زیادہ عقیدت تھی ان کے پورے دیوان میں شمالی ہند کے صرف ایک شاعر کا دو دفعہ نام آیا ہے اور وہ میر کا ہے ایک شعر میں صفا کہتے ہیں ؎

استادوں کی خدمت سے صفا دور پڑے ہم تھی ورنہ بلاشک یہ غزل میر کے لائق

ایک اور شعر میں صفا نے میر کی ادبی خدمات کا اعتراف کیا ہے۔ دیوان کرم خوردہ ہونے کی وجہ سے پہلا مصرع پڑھا نہیں گیا۔ دوسرا مصرع یہ ہے ؏

اس رتبہ کو پہنچی یہ زباں میر کے باعث

میر ۱۱۹۶ھ میں لکھنؤ پہنچے ہیں اور صفا ۱۱۹۹ھ سے قبل لکھنؤ کو خیرباد کہہ چکے تھے۔ اس ترکِ وطن کی شہادت وہ قطعہ تاریخ ہے جو صفا نے حیدرآباد میں لکھا تھا اور جس سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ آصف جاہ بھی صفا کے مربیّن میں تھے۔ یہ قطعہ شاہ تجلی علی نے نقل کیا ہے۔

آصفِ دوراں سلیماں منزلت اختصارے نامِ نقش نگینِ آفتاب

ساخت قصرے پیش بر آئینہ صاف شمۂ او ہم قرینِ آفتاب

از فروغِ ارشتہ او آسماں صاف گویدش نشینِ آفتاب[۲]

۱۱۹۹

---

(۱) صفا کے حالات محبوب الزمن (تذکرہ شعرائے دکن) ص ۶۱۵ سے لئے گئے ہیں۔ ان کا ذکر کسی اور تذکرے میں میری نظر سے نہیں گذرا (۲) مجموعہ الفصاحت (قلمی) کتب خانہ آصفیہ۔

اگر صفاؔ کو میرؔ سے واقعی تلمذ تھا۔ تو یہ زمانہ غالباً ۱۱۹۶ھ اور ۱۱۹۹ھ کے درمیان کا رہا ہوگا۔
صاحب محبوب الزمن نے لکھا ہے کہ صفاؔ لکھنؤ سے بنگالہ گئے۔ وہاں سے چینا پٹن پہنچے اور پھر ابوالقاسم المخاطب میر عالم مدار المہام کے عہد میں حیدرآباد دکن آگئے۔ چند روز میر عالم کی سرکار میں ملازم رہے۔ اس وقت تک صفاؔ گم نامی کی زندگی گزار رہے تھے۔ آخر رفتہ رفتہ ان کے جوہر چمکے اور شہرت ہونے لگی تو راجہ چندو لال مہاراجہ بہادر کے دربار میں باریاب ہوئے چونکہ مہاراج شعر و سخن کے شیفتہ، صاحب مذاق اور قدردان تھے، انھوں نے صفاؔ کو اپنا مصاحب بنا لیا اور پانچ روپے ماہوار مقرر کر دیا صفاؔ نے پوری زندگی مہاراج کے دربار میں گزار دی۔ محبوب الزمن میں ان کا سنہ وفات ۱۲۲۰ھ دیا گیا ہے جس کے متعلق فی الحال کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ یہ یقینی امر ہے کہ ۱۲۴۹ھ تک وہ حیات تھے کیونکہ انھوں نے کسی ہمت علی خاں کی شادی پر قطعہ تہنیت کہا تھا جو حسب ذیل ہے ؎

عشرت خورشید طلعت ماہ رو جلوہ گر شد با ہزاراں آرزو
از برائے تہنیت ہمت بگو وصل ماہ و مشتری آمد نکو
۱۲۴۹ھ

صفاؔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ کتب خانہ آصفیہ میں ان کا مختصر سا اردو دیوان موجود ہے جس میں بیشتر غزلیں میرؔ کی زمینوں میں ہیں۔ آخر میں مثنوی بھی مختصر بھی شامل ہے اس مثنوی کا ایک نسخہ ادارہ ادبیات اردو میں ایک کتب خانہ جامعہ عثمانیہ میں اور ایک انجمن ترقی اردو ہند دہلی گڑھ کے کتب خانے میں موجود ہے۔ سالار جنگ لائبریری حیدرآباد میں صفاؔ کی ایک تالیف مناظرہ صفاؔ و فیاضیؔ کا ایک قلمی نسخہ ہے جس کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ صفاؔ نے اردو محاورں پر کوئی کتاب لکھی تھی جس پر ناظمؔ دہلوی اور فیاضیؔ دہلوی نے اعتراضات کئے۔ اس کتاب میں ان اعتراضات کے جواب دئے گئے ہیں۔
صفاؔ کی تحریر کے علاوہ اس میں ایک دیباچہ مرزا حسن کا اور ایک مرزا علی بخت کا دیباچہ ہے۔ پھر میر حسن کی مثنوی خوان نعمت ہے۔ اور سب سے آخر میں "مثنوی در تعریف فیض آباد" ہے۔ جو دراصل میر حسن کی مثنوی "گلزار ارم" کا ایک حصہ ہے۔ پوری کتاب کا کاغذ اور کاتب ایک ہی ہے مثنویوں پر اُن کے مصنف کا نام نہیں دیا گیا۔ دیباچہ میں حسن نے لکھا ہے کہ مذہبی اختلافات کی وجہ

میرے اور مصحفی کے زیادہ تعلقات نہیں۔ مصحفی میرے ہم شہر ہیں۔ میر حسن نے اردوئے معلی پر فخر کیا ہے اور اسے مستند زبان تسلیم کیا ہے۔ ان شواہد کی روشنی میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ دیباچہ میر حسن کا لکھا ہوا ہے اور کاتب کی غلطی سے ان کا نام مرزا احسن لکھا گیا۔ لیکن مصحفی لکھتے ہیں کہ وہ کتاب جس میں ناظم اور فیاضی نے مجھ پر اعتراض کئے ہیں۔ آج کی تاریخ یعنی سیزدہم صفر المظفر ۱۲۲۱ کو مجھے ملی۔ میر حسن کا ۱۲۰۱ھ میں انتقال ہوگیا تھا۔ اس لئے مزید تحقیق کے بغیر اس دیباچے کے متعلق کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ چونکہ اردو نثر پر کام کرنے والوں کے لئے یہ دیباچہ بہت اہم ہے۔ اس لئے یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

دیباچۂ مرزا احسن برالصاف کلام راست انجام
سید ذوالفقار علی خاں الحسینی صفائے لکھنوی سلمہ اللہ تعالیٰ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد الخالق البرایا — والشکر لواہب العطایا
اے خامہ حرف سنج بجز ام — در راہ سخنوری بنہ کلام
تیغ دو زبان خلاف معدوم — مشہور ہے تو ز شام تا روم
ہیں حکم میں تیرے ہفت اقلیم — چاہے جسے بخشے تخت و دیہیم
ہے ملک سخن کی تجکو شاہی — کاغذ یہ کا بی ہے سیاہی
لاکھوں ہیں تیری صفت کے دفتر — جو اس کو نجانے سو ابتر

سبحان اللہ عجب تسلسل ہے۔ اور اختلاف زمانے کا اور کج فہموں کے راستی بتلانے کا کہ قلم دو زبان از دونوں بیاں سے قاصر ہے۔ اور سینۂ چاک اور آنکھ دوات کی مانند چشم غزال کے مقابل شمامہ یا کے خجل اور شرمناک وطرفہ حقیقت یہ ہے کہ جو نخل بند گلدستہ معانی کے اور صراف عیار سخن دانی کے ہیں، وہ کساد بازار دیکھ کے غنچۂ دل بار غم سے نہیں کھولتے اور انعدام مشتری کا سمجھ کر لولوے آب دار سخن کی قیمت سنگ دلوں میں نہیں بولتے تیس پر نوآموز دو نوسکھ ہیں اور اب تلک سر رشتہ بات کا اون کے ہاتھ نہیں۔ بلکہ اون کی لکڑی ابھی تکلی میں تار تار ہو رہی ہے۔ تانا بانا لے کے ادھیڑ بن میں کھوتے بات کو پائے جاتے ہیں اور ہر وقت محو باریک بانی کے ہو کر رشتۂ سخن کا توڑ توڑ پھر تھوک سے جوڑ جوڑ مانند تسبیح تکھوت کے اپنے گرد دیکھ ! پھیرے

بے تار و پود خیال کا اُمھر ہوا میں تانتے ہیں۔ نیک بختوں کے عجب دل ہیں کہ چرخ سے خصم
کی چرخ زنی سے غافل ہیں۔ مومن کو چاہیئے کہ بات مسلمانوں کی مانے اور ناحق تتو کوں ستوز سانے
گھوڑا خیال کا میدان بازی گاہ میں مانند طفل بے سواد کے کیوں دوڑاتے ہیں اور مثال پدڑی کے
اپنے مشت پر پر رحم نہ لاکر ناحق ہاتھیوں کے ساتھ کیوں گتے کھاتے ہیں۔ نیک بختوں کو کیا ہوا ہے
کہ ہوس نفس سے پیرا اپنے قلم کا داتوں میں ڈبو کر نئے نئے مضامین کی بکارت توڑتے ہیں اور اس کو
فعل مردانگی جان کر میدان سخن وری میں مردوں کے ساتھ منہ جوڑتے ہیں۔ ازبس سرہم بندے
دو چار ٹوٹے پھوٹے نقرے بے معنی سیکھے سکھائے جوڑ کر شعر کی آبرو ریزی پر کمر باندھتے ہیں اور
کمیت کلک باد رفتار کو چراگاہ قرطاس میں حبل المتین وہم سے کدھیا چھانڈن چھانڈتے ہیں ؎

گر نوشت و خواند کا دعوا کرے | بے خبر ہو تو کوئی اس میں کیا کرے
کون ہے ایسا سخن کا دادرس | ناخن دانش سے عقدہ حل کرے

تحفہ کی تو یہ ہے کہ بعض سخن آرایش ویرانی کے کہ خبر اور قبر و خلقت اور قلمت میں امتیاز نہیں کرتے
اور اپنی فصاحت پر مرتے ہیں۔ بیت

باغ میں کوے کا ہنسنا بلبلوں کی موت ہے | کیونکہ وہ تو خوش نوا ہیں اور وہ بوالہوس ہے

عجب واردات ہے ہندوستان میں دستور ہے جو اہل کمال ہیں ہرچند زبان دانی اور قابلیت میں
لاثانی ہوتے ہیں لیکن اپنی زبان سے خودستائی کا تو کیا مذکور ہے۔ اگر دوسرا بھی تعریف کرے
تو خجالت سے پانی پانی ہوتے ہیں۔

سخن اگر کہتے ہیں تو سمجھ کر کہتے ہیں۔ اور نکتہ چینوں سے آٹھ پہر محترز رہتے ہیں۔ بخلاف
یہاں کے رہنے والے جانیں نہ بوجھیں بکنے سے کام۔ بالجملہ محرر کو ان باتوں سے کیا سروکار ہے۔
ہر کوئی اپنی بات کا مختار ہے لیکن منظور ہے کہ جو لوگ فن شاعری اور زبان فصیح البیان اہل ہندوستان
سے کہ عبارت اردوئے معلی سے ہے واقف نہ ہوویں اپنی جگہ بیٹھ کے نادانی کی راہ سے بعضے محاورہ
ریختہ میں دخل اور جرح کر کے ہندی بات کو کلہے کو کھو دیں۔ پس وہ یقین جانیں کہ ان کو زبان سے
اہل ہند کی آگاہی نہیں ہے کیونکہ مقلد ہیں۔ اور لازم یہ ہے کہ ایسی باتوں کو سمجھ کر اپنے جبل مرکب سے
باز رہیں۔ گو میدان سینہ زوری کا وسیع ہے چاہے جتنا اچھلیں اور کودیں لیکن جو اشنائے حقیقت

ہیں ہیں اور سیاہ و سفید میں امتیاز کرسکتے ہیں۔ اگر چاہیں کہ اپنا ٹٹو منزل کو پہنچا دیں اہل اردو کو خضر
سبیل الرشادجان کے چور راہ سے راستہ بادشاہی پر آویں۔ حاصل اس قیل وقال سے یہ ہے کہ
ایک سید عالی نسب والا دودمان سید ذوالفقار علی خاں الحسینی صفا لکھنوی کہ میرے ہم شہر اور
صدر نشیں بزم سخن دانی یکتا زمضمار حرف آرائی و نکتہ دانی۔ ناظم طوری ان کے اور اساتذہ کے کلام
کو نہ سمجھ (دیکھ) کر رد و قدح بے معنی درپیش لائے ہیں۔ میں نے بہ نظر تامل اور غور کی راہ سے مدعی اور مدعا علیہ
کے مباحثہ کو دیکھا۔ زمین سے آسمان تک فرق پایا۔ اگرچہ محرر کے اور ان کے درمیان اتنی گرم جوشی بسبب
اختلاف کیش کے نہیں ہے لیکن انصاف سے گذرنا اور حق پوشی کرنا عقل اور دانش سے مستبعد ہے۔
ان کے کلام سے ناظم کو نسبت کیا جس شخص کو جس زبان میں بے گانگی ہے، اگر اس میں قدم دعویٰ دھرے
اپنے نزدیک تو خبط اور دیوانگی ہے۔ ناعنر لنا بفصلکؐ یا سامع الکلام۔ اس شہر میں حسن ہے
نزیب الوطن مقیم۔ یہ حرف دوستانہ بیگستافی تمام قرطاس پر لکھا ہے۔ زرہ سے امید وبیم لازم تو یہ
ہے کہ آدمی منصف ہو والا اس میں اور بہایم میں فرق نہیں کس واسطے کہ انسان سالقہ عدالت
کے قوت منعدل رکھتا ہے۔ اور حیوان سوا لگد زنی کے اور کاٹ کھانے کے کچھ نہیں جانتا۔ اس صورت
میں جو لوگ عادل ہوں گے قائل ہو بدعا ئے خیر اس عاصی کے حق میں رہیں گے اور جو جاہل ہوں گے
زبان بدگوئی کتے کی طرح منہ ہانپ ہانپ کر نکال باہر لٹکا دیں گے بہر صورت از دہن سگ محیط
نجس نخواہد شد۔

تمت الکتاب
بعون ملک الوہاب
در دیوان خانہ صفدر جنگ
بتاریخ ۲۵ ربیع الاول ۱۲۷۲ھ

انتخاب دیوانِ صؔفا

کبھو ایک پرزہ بھی ہم کو نہ لکھا کیوں صاحب ۔۔۔ آپ کو دمڑی کا کاغذ نہ ملا کیوں صاحب
اتنا کچھ دیکھ کے اب بھی سمجھ آئی کہ نہیں ۔۔۔ میں نہ کہتا تھا کہ ہیں کون صؔفا کیوں صاحب

بولا سن نالۂ و فریاد دلِ زار کی رات — تجھ بے میاں کاٹنے سے کٹتی نہیں بیمار کی رات

کھینچے نہ مانی سے اُس رشکِ حور کی صورت — وہ ماہ چہرہ سراپا ہے نور کی صورت
کہیں دھواں نہ نکلے و در رہو حضرتِ دل — بھڑک رہا ہے میرا دل تنور کی صورت
صفا برا کسے کہیئے، کسے بھلا کہیئے — عیاں ہے سب میں اُسی ایک نور کی صورت

ہم نہ ہوتے نہ الم عقدہ دل کا ہوتا — قطرہ موتی نہ بنا ہوتا تو دریا ہوتا
چار دن زیست کے شاید کہ بخوبی کٹتے — نہ اگر دغدغۂ وعدۂ فردا ہوتا

گھر گھر جو یہ چرچہ ہے مرے سوزِ نہاں کا — میں شمع صفت کشتہ ہوں کم بخت زباں کا
اس الفت ہستی نے عدم مفت چھڑایا — آخر کو ہوا میں نہ یہاں کا نہ وہاں کا
یہ راہ بڑی سخت ہے او یار مسافر — اتنا تو صفا محو نہ ہو خوابِ گراں کا

جب کہ اُس بت کو ہم نے رام کیا — جھک کے کعبہ کے تئیں سلام کیا
آہ کی بھی تو ہونٹوں تک — نالہ بھی دل کو تھام تھام کیا
اے صفا عشق اور یہ صورت — آپ نے بھی خیالِ خام کیا

خیال خط و خال اب دل سے ٹوٹا — بلا سے بڑا جی کا جنجال چھوٹا
عجب روٹھنا دل کا دیکھا انوکھا — بڑی منتوں سے مناجب کہ روٹھا

گل ہووے نہ آہ داغ دل کا — روشن رہے یہ چراغ دل کا
اے وائے ہم آپ ہی ہوئے گم — لیکن نہ ملا سراغ دل کا
کس فکر میں ہو صفا خبردار — پھر تازہ ہوا ہے داغ دل کا

غنچہ وگل سے غرض کیا مرغِ حسرت زاد کو — آنکھ جو کھولی تو دیکھا صورتِ صیاد کو
ایک نالہ کر دکھاؤں جیدہ تیجے بنیاد کو — کیا کروں یاری نہیں دیتا جگر فریاد کو
حوصلہ تو دیکھو کس صورت کا باندھا ہے خیال — طرفہ کم بختی نے گھیرا ہے یہاں بہزاد کو
کس طرح نشتر لگا یا سامو لیلیٰ کے بیچ — خون کا دعویٰ تھا شاید قیس سے فصاد کو

[illegible]

زہے بگاڑ کر گویا کبھی کا میل نہ تھا — یہی مثل ہے کہ پھر ان تلوں میں تیل نہ تھا
شب اُن کے بالوں میں آتی جو تھی انوکھی بو — سکندرائی کی بو باس تھی پھلیل نہ تھا

مسیحائی کو جب مثلِ مسیحا یار اُٹھ بیٹھا — صدائے قُم بازلی سن کے میں ایک بار اٹھ بیٹھا
خدا ہی جانے دیوانہ کو تیرے کیا خیال آیا — جو سوتے سوتے زانوے پر دو ہتڑ مار اٹھ بیٹھا

میں جا کے کیا کروں گلزار، دل نہیں لگتا — بغیر تیرے کہیں یار دل نہیں لگتا
سخن کی فکر میں ایک دم ہی غم غلط ہوتا — بلا سے کیا کروں بے کار دل نہیں لگتا
مرید حضرت منصور ہیں مرے آنسو — سوائے فتنہ کے زنہار دل نہیں لگتا
صفا کو سوئے وطن بھیج یا حضور والا — دکن میں اے میرے سردار دل نہیں لگتا

جب کہ عاشق خطاب تھا اپنا — بادشاہوں کا داب تھا اپنا
اپنی جادو بہ کشش تھی بادِ بہار — ابر تر سیر آب تھا اپنا
عہد لیلیٰ کا اور زمانہ قیس — ابتدا شباب تھا اپنا

صبح

کیا بھلا چنگا تھا کافر معنت سودا ہو گیا ہائے میرے لاڈلے دل یہ تجھے کیا ہو گیا
گل جو کھسیانہ ہوا گل دیکھ اس کا رنگ روپ مجھ سے اور بلبل سے ناحق کو جھگڑا ہو گیا

دل پھنس گیا اس زلف کی گرہ کے باعث (کذا) دیوانہ رہا قید میں زنجیر کے باعث
تقدیر کا لکھا نہیں مٹتا کسی ڈھب سے ناحق کو نہ ہو ناصحو تدبیر کے باعث
کب ریختہ کو یوں ہی صفا تھی یہ فصاحت اس رتبہ کو پہنچی یہ زباں میر کے باعث

رقم کو قصہ دل کے جو میں لیا کاغذ شرر یہ آنکھ سے ٹپکے کہ جل گیا کاغذ
دیا اُسے جو مرے نامہ بر نے جا کاغذ جھڑک کے کہنے لگا چل بے دُت اٹھا کاغذ

سمجھائیں کہ اترا مرے گھر تخت پری کا بن ٹھن کے جو بیٹھے وہ سر شام پلنگ پر
اتنا ہی کہا میں نے مرے سر کی سو پیارے یار آج تو چل سو تو وہیں لب بام پلنگ پر
یہ سنتے ہی لے تکیہ کو سر سے میرے مارا اور سیکڑوں چلنے لگے دشنام پلنگ پر
پھر بولے یہی خبر ہے آیا ہے جہاں سے مرہ وہیں جا کر تیرا کیا کام پلنگ پر
یہ کہہ کے صفا ادن نے جو وہاں تانا دوپٹہ ہم لوٹ گئے اپنا جگر تھام پلنگ پر

کس لئے یوں خرم و خنداں ہے گل باغ میں وائے غفلت شب کے شب مہماں ہے گل باغ میں
مغتنم جانو اسے ایک آن ہے گل باغ میں عندلیبو رات بھر مہمان ہے گل باغ میں
ایک دو دم کا جو تو مہمان ہے گل باغ میں اس لئے تیرا یہ اتنا مان ہے گل با[illegible]

مثنوی چھومنتر

انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ کے کتب خانے میں صفا کی مثنوی چھومنتر کے تین مخطوطے ہیں۔ ان میں سے دو ناقص الاول و ناقص الاخر ہیں۔ تیسرا مخطوطہ مکمل مگر کرم خوردہ ہے، جس کی وجہ سے جابجا الفاظ پڑھے نہیں جاتے۔ مندرجہ ذیل متن ان ہی تینوں مخطوطوں کی مدد سے مرتب کیا گیا ہے۔ کرم خوردہ الفاظ کی جگہ پر نقطے دے دیے گئے ہیں۔

(محمد عتیق صدیقی)

محو ہے ساری خدائی عشق کی — بل بے کافر ماجرائی عشق کی

یا تھا اپنے دم قدم کا . . — یا تو بہلایا صنم کا . .

کفر سے صنماں کو یا وہ عار تھی — یا رگِ جاں بدتر از زنار تھی

سرگذشت اس راہ میں رکھتے ہیں پاؤں — یاں کے بھولوں کا ٹھکانا ہے نہ ٹھاؤں

تا بہ منزل گو کہ سیدھی لیک ہے — لیک رستہ بال سے باریک ہے

کوہکن سے شرط وہ مشکل لگی — یاں جنابِ عشق کی تھی دل لگی

تھا نہ تنہا کوہکن کو یہ جنوں — کس کی شیریں اور کدھر کا بے ستوں

کھو بیے دفتر جو دل کی یاد کا — نکلے خوں کا فریہ سو فرہاد کا

وہ اٹھاوے نفع اس بیوپار میں — مثل یوسف جو بکے بازار میں

ہاں ذرا ہشیار اے رسوائے عشق — ٹک سمجھ کر کیجیو سودائے عشق

آشنا جو اس کے ہے آئین کا — نے وہ دنیا کا ہوا نے دین کا

بے . . پر نظر اس کی نہ جائے — شیشۂ خالی نہ ہرگز منہ لگائے

اس بلا کی دل جلوں پر چوٹ ہے — جانِ مشتاقاں پہ کا فر لوٹ ہے

بس قلم اب گوش سوے پند رکھ — دو گھڑی اپنی زباں کو بند رکھ

فرقِ زشت و امتیازِ نیک کر ابتدا اور انتہا مت ایک کر
گو کہ ہے مجھ میں صدائے عندلیب ہے نوا تیری نوائے عندلیب
..... پر نہ ہو نالاں بھوڑ نالۂ بلبل نہ گل کے کان پھوڑ
باقی رہنے دے اثر احسان کا تجھ کو بتلادیں گے ہم گھر تان کا
یارِ منزل کا شی منظور ہے (؟) بھائی . . خامہ دہلی دور ہے
خود بخود کیوں رکتی آتی سانس ہے پہلوئے دل بیچ جیسے پھانس ہے
کیوں کلیجہ مبتلائے درد ہے کیوں نکلتی دل سے آہِ سرد ہے
خاطرِ وارستہ کیوں افسردہ ہے دل بہ رنگِ غنچہ کیوں پژمردہ ہے
کیوں خوش آیا مجھ کو صحرائے جنوں کیوں ہوا محوِ سراپائے جنوں

دیدۂ بے خواب کو کیا کیف ہے ہر ذرہ کیوں ملتی دستِ حیف ہے
دل ہے آپ ہی آپ کیوں گھبرا گیا بات کہتے، دیکھو رونا آگیا
کس فسانے بیچ جا الجھا ہے دل کیوں مجھے یکبار گی بھولا ہے دل
جڑھ گئی کس زلف کی یہ لہر ہے خود بخود کیوں تن میں چھٹا نہر ہے
جو مرے مضمون کی تسطیر ہے زلف ہے یا حلقۂ زنجیر ہے
یوں جو غم دل میں ہوا جاگیر ہے ہو نہ ہو کچھ عشق کی تاثیر ہے
دوستو میں کیا کہوں اس دل کا حال غنچہ ساں منہ میں زباں ہوتی ہے لال
سرگذشتے دارم از تاثیرِ عشق نقلے از گیرائیِ زنجیرِ عشق

شروعِ داستان

دردمندو کیا بیانِ درد ہے عاشقو کیا داستانِ درد ہے
ماجرا ہے زود ہی ناشاد کا کشتہ ہے صد ناوکِ بیداد کا
ہے یہ قصہ اک جوانِ زار کا چشمِ نا انصاف کے بیمار کا
سنتے ہی کہتا پھل، دِھل جائیے شمعِ محفل ہو، کھڑے جل جائیے
کیا کہوں جیسا کہ وہ ناشاد تھا بے ستونِ عشق کا فرہاد تھا

عشق میں مجنوں سے بھی فائق تھا　　طالب لیلیٰ کا لیکن ذوق تھا
صرف پڑھتا تھا تو از میزانِ عشق　　صیغہ گردانے تو از گردانِ عشق
تھی جہاں اعرابِ تقدیری کی بحث　　یاد کرتا تھا ادا لیلیٰ کی بحث
نحو میں جس جا مثالِ زید تھی　　پھر کسی یوسف ہی کی واں قید تھی
ذہن کو ترکیب پر جب تولتا　　جملۂ یوسف زلیخا بولتا
نے بیاں سے نے معانی سے غرض　　تھی تو کچھ اپنی کہانی سے غرض
جب خیالِ لاابالی باندھتا　　حاشیہ اس پر خیالی باندھتا
سر بسر پابند تھا تقلید کا　　تو کہے شارح تھا وہ تجرید کا
ہر اشارے پیچ سو گھات اس کو یاد　　شیخ کے سارے اشارات اس کو یاد
خبط کو دل کی دوا سمجھا تھا وہ　　زورِ قانونِ شفا سمجھا تھا وہ
حسنِ تقریر تا دل بر زباں　　مختصر سے تا مطول بر زباں
چھیڑیے گر قانونِ منطق ذکر میں　　دخل کیا آوے خطا کچھ فکر میں
بس کہ در ہر لفظ سوز و ساز تھا　　شاہدِ معنیٰ کو اس پر ناز تھا
نے غرض تھی علم سے نے از کتاب　　اور ہی کچھ ہیئت تھی اور ہی کچھ حساب
رات دن آوارگی سے کام تھا　　کشورِ الفت میں وہ بدنام تھا
جس گھڑی ہوتی فراغت از سبق　　طاق پر دھر علم و دانش کے ورق
پھرتا چوراہے میں جا بازار کے　　دل کے سیپارے بغل میں مار کے
جس گھڑی آتا نظر کوئی شعلہ رو　　لاکھ ڈھب سے ہو کے اس سے دوبدو
ساتھ لگ جاتا صدا کچھ پھینکتا　　ہر طرح گرما کے آنکھیں سینکتا
الغرض اک روز بھرتا آہِ سرد　　شہر بندِ حسن کا وہ کوچہ گرد
بے خود و مبہوت اپنی لہر میں　　سیر کو نکلا بنارس شہر میں
دیکھا کیا اک شور در بازار ہے　　چار جانب عشق اتیاچار ہے
قتل مہ اک تازہ صرافت ہے　　دل کی ہر کمائی میں گرم الفت ہے

نیچ

ہے پلک جدھر سے شرما پھیرتا — سو کلیجے پیچ برما پھیرتا
سر پہ اس موجی کے ہے دستار زر — جیسے سورج جڑ دیا ہو چاند پر
کھینچا صندل کا جبیں پہ کھور ہے — عاشقوں کے درد سر کا غور ہے
ترچھی چتون جس طرح تیرِ سناں — اولٹی پلکیں جیسے بختِ عاشقاں
چشم کی گردش بلائے جام ہے — بزمِ مستاں پر صلائے عام ہے
حسن عارض دل ربائے شیخ و شاب — جوں بھری شیشے کے اندر ہو شراب
بینی برہانِ قدرتِ اللہ پر — معجزہ انگشت روئے ماہ پر
کھل گئیں زلفیں تو بدلی اوند گئی — ہنس پڑا تو جیسے بجلی کوند گئی
تھی ذقن وہ تعر میں جس چاہ کے — مارتا تھا ڈھنگ، مسافر راہ کے
دامِ گیسو جان کا جنجال تھا — جنبشِ بھوں سے بندھا بھونچال تھا
تھی خجل یاقوت کی لب سے دمک — دانتوں سے شرمندہ ہیرے کی چمک
قد کو اس کے جس نے دیکھا بولا آہ! — واہ! باغِ حسن کے شمشاد واہ!
وصف سینہ میں ہے ایک پردے کی آڑ — کھول دیجے ورنہ چھاتی کے کنواڑ
چھیڑئیے کچھ ذکر گر زنار کا — پھر گریباں سے ہو جھگڑا تار کا
آگے کیا کہیئے، کمر تو ہیچ ہے — واں فقط بٹکے کا کا فر پیچ ہے
پشت پا پیشانیٔ لیلائے عشق — سر سے پاؤں تک بلا بالائے عشق
کیوں نہ اُن تلووں پہ رکھے سینہ چاند — بیسوں ناخن میں جڑے ہیں بیس چاند
جس گھڑی اس سے ہوا یہ چار چشم — اور اس پر جا پڑی یک بار چشم
دفعتاً چتون سے چتون لڑ گئی — اور وہ ترکوں کی پلٹن لڑ گئی
دیکھ جھل بل زلفِ مشکیں فام کے — گر پڑا، دل دونوں ہاتھوں تھام کے
کیا کہوں پھر جیسے اس پر وار تھے — لاکھ ناوک ایک دل کے پار تھے
نے بدن میں جی نہ منہ پر رنگ تھا — خود غلط لاجنبش مثل سنگ تھا
پھر تو وہ دوڑے جو کہ دولت خواہ تھے — یعنی آہ و نالہ جو ہمراہ تھے

دی تسلی نالۂ جاں کاہ نے
دست گیری کی عصائے آہ نے

الغرض جس تس طرح اُٹھ راہ سے
ہو کھڑا زور عصائے آہ سے

چشم تر سے گردِ رو دھوتا ہوا
گھر کی جانب اٹھ چلا روتا ہوا

کیا چلے زنجیر پا تھی زندگی
سخت جانی سے تھی سو شرمندگی

نے تمیزِ دن، نہ ہوشِ رات تھا
پاؤں رستہ پر جگر پر ہات تھا

اس طرح سے کاٹتا اوقات کو
مدرسہ میں پہنچا آدھی رات کو

طاق سے لی جو مطالعہ کو کتاب
عشق بولا پڑھ چکا بس دھو کتاب

دیکھتا گر نحو دیکھا یا کہ صرف
پوچ ہے یاں بحثِ فعل و اسم و حرف

جس کو یہ مکتب دکھایا عشق نے
یک سبق اور ہی پڑھایا عشق نے

یار ملائی نہیں، یہ عشق ہے
مکتب آرائی نہیں، یہ عشق ہے

بھول مت تسوید چند اوراق پر
یاد رکھ دے کتابیں طاق پر

پر دلِ شیدا کو مت نومید کر
اس دبستاں کی بھی چندے دید کر

یاد کر بسم اللہ ابروے یار
ہو ذرہ محوِ کتابِ روے یار

ہے کرم تجھ پر اگر استاد کا
ہم سبق ہوتا ہے تو فرہاد کا

چار دن بھی گو تیا کم درس ہو
کیا عجب جو قیس سے ہم درس ہو

بو علی سینا ہے ہر مجنوں یاں
طفل ابجد خواں ہے افلاطون یاں

دیکھ اس مکتب کو وہ گم کردہ ہوش
دل ہی دل میں کھا کے یک جوش و خروش

خود فراموشی سے جو حیراں ہوا
خواندہ و ناخواندہ سب یکساں ہوا

جو کوئی ہم درس اس کا پیار سے
پوچھتا تھا آ کے سو تکرار سے

کیوں میاں کچھ قاعدے از بر ہوے
کہتا تھا، بس یار پڑھ بہتر ہوئے

وقت بن محبوب کے کٹتا نہ تھا
رات کٹتی تھی تو دن کٹتا نہ تھا

آتشِ الفت کا کھا سینہ میں داغ
علم سے تو ہو چکے صاحب فراغ

چین نہ شب کو، نہ دن آرام تھا
کام باقی تھا، تو اتنا کام تھا

کرکے پھیرا کوچۂ دل دار میں — صبح آکر چار سو بازار میں

تھا علاقہ اس کو جس مغرور سے — دیکھتا تھا اس کو تنہا دور سے

شغلِ تنہائی و سوز و سازِ عشق — بولے کیا معنی کسی سے رازِ عشق

آپ ہی ہوتا شاد آپ ہی کھنچتا — بات آپ ہی کرتا آپ ہی ریجھتا

بے خودی سے جوش کھو دیتا کبھی — خود بہ خود چلا کے رو دیتا کبھی

دم بہ دم رہ رہ کے اک بڑ مارتا — ہنس کے زانو پر دو ہتڑ مارتا

کھینچتا جب نعرہ آہِ سرد کا — آنکھیں بھر پڑھتا یہ مطلع درد کا

"سینہ و دل حسرتوں سے چھا گیا — بس ہجومِ یاس جی گھبرا گیا"

الغرض چندے تو گذری اس طرح — خوش رہے رکھا خدا نے جس طرح

صبح طوفِ کوچۂ دل دار تھا — شام کو زلفِ رسا کا تار تھا

پھر تو جس جا پہ جذبِ چاہ ہو — دل کو کیا معنی نہ دل سے راہ ہو

دونوں کو یکجا جو پایا عشق نے — ٹھاٹ دونا کر دکھایا عشق نے

ایک تھا اپنی خریداری پہ غش — ایک اپنی گرم بازاری پہ غش

دونوں نے یک ساں جگر پیدا کیا — دل نے دونوں کے اثر پیدا کیا

جان یوں باہم کی پھر مشتاق تھی — جس سے یک دم کی جدائی شاق تھی

بعد ایک دم کے جو ہوتی چار چشم — ڈبڈباتی دونوں کی یک بار چشم

دل میں پھر کیا جانے کیا لاتے وہیں — مسکرا کر آنسو پی جاتے وہیں

در بیانِ بیمار شدن صراف

کس سے کہئے کینہ جوئی چرخ کی — کج روی اور زشت خوئی چرخ کی

یار مت کر اعتبارِ زندگی — خواب ہے یہ سب بہارِ زندگی

کیسے کیسے سروِ رعنا گر گئے — کیسے کیسے نخل انداز پا گر گئے

گل ادھر ہنسنے نہ پاتا تھا کہ بس — تھا چمن میں پھر وہی خاشاک و خس

بے ثباتی اپنی تو معلوم ہے — یہ بھی جھوٹی چاندنی کی دھوم ہے

نرگس آنکھیں موندے کیا پچھ کو رہے   پلک پلک جھپکے نہ جھپکے بھو رہے
الغرض وہ لالۂ بستانِ عشق   نخلِ نوخیز بہارِ بستانِ عشق
تھا بھلا چنگا کہ یک باری گرا   تپ سے بربالینِ بیماری گرا
آگے کیا کہئے اس کی اب بے حالیاں   یا جنابِ عشق کی دلالیاں
بیچ کھوٹے درموں اک انجان کو   تختہ مارا یار نے دوکان کو
جب سنا عاشق نے یوں اسرار ہے   اور مسیحا اپنا یوں بیمار ہے
پھر خرابی اس کی پوچھا چاہیئے   اضطراری اس کی پوچھا چاہیئے
تپ اُدھر چڑھی تھی باری کے اُوپر   یہ تھے بیٹھے دم شماری کے اوپر
اس طرف دستِ طبیعت ونبض تھی   اِس طرف کو روح ہوتی قبض تھی
اُس طرف کو شدتِ بحران تھی   اِس طرف گویا لبوں پر جان تھی
حکم واں پرہیز کا یک چند تھا   یاں تو مطلق دانہ پانی بند تھا
دو گھڑی گر واں مرض کا جوش تھا   اِس کو دو دو دن نہ آتا ہوش تھا
اُس کو اپنی ناتوانی کا گلہ   اِس کو اپنی سخت جانی کا گِلہ
درد سے وہ تو بہ بستر لوٹتا   یہ زمیں پر جوں کبوتر لوٹتا

دربیانِ رحلت نمودن صراف

آہ کیا کہئے اجل کی تیزیاں   شاہبازِ موت کی خوں ریزیاں
یا تو اس سے شہرِ حسن آباد تھا   یا وہ جلوہ شمع روسہ باد تھا
جان سے آخر نہ چھوڑا موت نے   وہ گلِ نورستہ توڑا موت نے
کیا کہئے بس شوق کا ملِ بجھ گیا   کیا چراغِ محفلِ دل بجھ گیا
کیا صنم اس خاک داں سے اٹھ گیا   آہ کیا کافر جہاں سے اُٹھ گیا
وہ نہ سفاکی نہ وہ سفاک تھا   ایک دم جلتے ہی جھگڑا پاک تھا

دربیانِ رحلت نمودن عاشق

آہ کے شعلے جگر کو پھونک دے   آتشِ دل خشک وتر کو پھونک دے

تاب کے یہ ضبط بس جی دکھ گیا
پھک گیا یے پھک گیا یے پھک گیا

دیکھ کر راتوں کو پروانے کی لاگ
شمع ساں سر سے کنفجلتی ہے آگ

پھاڑیئے اب پردۂ پندار کو
کوچ بہتر ہے دیارِ یار کو

پر تو کب ہیں جو ہوا پر جایئے
خاک ہو دوشِ صبا پر جایئے

چل بسا القصہ جب وہ رشکِ مہ
چشمِ عالم میں ہوا عالم سیاہ

خاک سر پر ڈالتے مادر پدر
لاش اس کی دھر کے کاندھوں کے اوپر

جوکہاں تھا اس ٹھکانے کو چلے
اپنے آئیں پر جلانے کو چلے

آرہتی کہیئے غضب یا قہر تھا
سینہ کوباں ساتھ سارا شہر تھا

واہ کیا گل زار لوٹا موت نے
حسن کا بازار لوٹا موت نے

بس کہ اک عالم کو اس کی چاہ تھی
ایک فوجِ عاشقاں ہم راہ تھی

حسن کا ماتم میں گریباں چاک تھا
جیب سے لے تا بہ دامن چاک تھا

آہ جب اس شمع رو کو آگ دی
اور دیسے شعلہ خو کو آگ دی

آگ میں بھی یوں تھی اس گل پر بہار
جیوں گلِ خورشید ہو در لالہ زار

شعلۂ حسن آگ کے اس روپ میں
یوں تھا جیسے گلِ دوپہری دھوپ میں

روح کب کی پہنچ منزل چکی
خاک بھی یوں خاک میں جب مل چکی

صبر کر مادر پدر تب گھر چلے
قوم سب ان کو تسلی کر چلے

کون تھا جس کا کہ دل پارہ نہ تھا
لیک جز از صبر چارا نہ تھا

نرگس آسا جو تھا حیرت ناک تھا
خَلِ شب سب کا گریباں چاک تھا

با پہنے کی اس کے جو پھر کر نگاہ
جا پڑی واں اس بلاکش پر نگاہ

دیکھا کیا، اک کشتۂ دل کی لاگ کا
سامنا باندھے کھڑا ہے آگ کا

سوئے آتش جان باندھے ہے کھڑا
عشق کا میدان باندھے ہے کھڑا

پہلے تو کر کر اشارہ دور سے
اس کو پھر پکارا دور سے

جب یہ دیکھا وہ نہیں دیتا جواب
تب تو آنزدیک با چشمِ پُر آب

دیکھتا کیا ہے پسر کا یارہے　　اپنے اس رشکِ قمر کا یارہے
بولا بس بھائی نہ دل پر جبر کر　　یار تیرا چل بسا تو صبر کر
کیا ہوا' تیرا جنم کا ساتھ تھا　　اُو دوانے اسارا دم کا ساتھ تھا
وہ تو اب سوئے عدم جاتا رہا　　دم کا ناتا تھا سو دم جاتا رہا
ہے ضرور اب احتیاطِ دل تجھے　　یاں کھڑے رہنے سے کیا حاصل تجھے
جس گھڑی یک بک کے یہ آیا بتنگ　　اور اس بے خود کو پایا مثلِ سنگ
نے وہاں وہ روح حاضر تھی نہ جسم　　تھا جنابِ عشق کا سارا طلسم
دیکھ کر تیرے کو اس ناکام کے　　آگے کھینچا ہاتھ اس کا تھام کے
ہاتھ کے لگنے ہی کی بس دیر تھی　　جو وہ صورت خاک کی اک ڈھیر تھی
واہ جی! کیا بازی جاں کر گیا　　زور کچھ کارِ نمایاں کر گیا
عشق کے کیا کیا نیا نو ناز ہیں　　خاک کے پتلے میں کیا کیا راز ہیں
اللہ ہی اللہ وہ خاکی طلسم　　گر مقید تو نہ ہو در قیدِ جسم
پھر خدا جانے کہ کیا دعویٰ کرے　　سر یہ اپنے کیا بلا بر پا کرے
بس زباں کو بند کر او بدنامِ عشق　　ایسا ہولیوے سو لیوے نامِ عشق
واقعی ایسوں کو طالب کہتے ہیں　　ان کو یک جاں اور دو قالب کہتے ہیں
کھپ گئے پر کام باقی رہ گیا　　گو موئے پر نام باقی رہ گیا
قدر گو پہلے نہ جانی عشق نے　　پر موئے پر آن مانی عشق نے
کیوں جگر پہتا نہیں ہو خونِ ناب　　سچ تو یہ ہے خانۂ طاقت خراب
آپ ناقل اس کہانی کا ہوں میں　　قائل اپنی سخت جانی کا ہوں میں

دربیانِ اختتامِ مثنوی

آپ بھی کیا بت بنے ہیں واہ جی!　　ڈول دیکھو آپ کا اللہ ہی اللہ جی!
تھا بہ ندھامت ہے یہ دل میں خیال　　کیجیے کوئی مثنوی در اہلِ حال
رو بیٹے کچھ کہہ کے حالِ درد کو　　یاں دیجے اک نہالِ درد کو

سن کے سوز و سازِ بالائے عشق — موند لے آنکھوں تلے دریائے عشق

کہئے ایسی مثنوی پُر اثر — اہل دل رو دیویں جس کو دیکھ کر

رکھتی ہو ہر سطر گیسو کی بہار — صفحہ میں ہو صفحۂ دُر کی بہار

خونِ دل سرخی کی جا پر دیجئے — از رگِ جاں تارِ مسطر کیجئے

یاں سے واں تک درد کی تاثیر ہو — سر بسر اک عشق کی تصویر ہو

منتخب ہر بیت کا مضموں ہو — ہو جو مصرع نالۂ موزوں ہو

گو کوئی قصہ نہ آیا اپنے ہات — ہات آئی مختصر سی ایک بات

دل جو تھا مایل نرالے رنگ کا — صاف ڈھالا نقشہ اپنے ڈھنگ کا

سحر کاری کر دکھائی عشق نے — ہات پر سرسوں جمائی عشق نے

سنیو ٹک اے آشنائے بحرِ پاس — عشق کے ناموس کا ہے مجھ کو پاس

ورنہ سارے پردۂ دل کھولتا — دل میں جو آتا سو منہ سے بولتا

کیا کروں لیکن نہیں حاضر حواس — بے طرح ہیں آج کل قائم حواس

عرصۂ فرصت نہایت تنگ ہے — پھر بھی اپنی مثنوی میاں دنگ ہے

بارک اللہ اے صفا کیا ہے خیال — ذہن نے پایا نہیں کچھ اختلال

زور دھن پر تیرا نرگس نامہ ہے — چہچہے پر عندلیبِ خامہ ہے

ہیکلِ جاں کے اسے قابل کہوں — یا اسے تعویزِ حولِ دل کہوں

کس نزاکت سے ہے پھولا باغِ دل — کیا کھلے ہیں لالہ زارِ داغِ دل

مرہمِ صد سینۂ پر داغ ہے — دل کی واشد کو عجائب باغ ہے

درد مندوں کے لئے درماں ہے یہ — دل کی بیماری کو حرزِ جاں ہے یہ

ایک رفیقِ دل ستاں کہئے اسے — یا انیسِ عاشقاں کہئے اسے

غم تراشِ خاطرِ محزوں ہے یہ — بہرِ تسخیرِ پری افسوں ہے یہ

زور افسوں کی کہو میاں کیوں نہ ہو — خوب چھو منتر کی لی میاں کیوں نہ ہو

اے معاذ اللہ نفسِ شوم سے — حق اماں دے ایسی بھی کی دھوم سے

کبر کیا آیا ہے طبع دون پر — فقرہاے چند ناموزون پر
دل میں آتا ہے کہ از سر رو دیئے — اس کو مثلِ لوحِ طفلاں دھوئیے
باز رکھئے بار محفل سے اسے — پھونک دیجے شعلہ دل سے اسے
یوں ارادہ تھا کہ دل نے پند دی — اور کسی کے سر کی چوٹ سوگند دی
یوں کہا او غرقِ بحرِ انفعال — واے نادانی کدھر آیا خیال
سہل سمجھا اختراعِ عشق کو — کوئی پھونکے ہے متاعِ عشق کو
ہاں اگر کچھ حسرتِ استاد ہے — تو بجا ہے یہ محل یاد ہے
مثنوی یہ عشق کی تصویر ہے — قابلِ نذرِ جنابِ میر ہے
سو تو یہ باقی فقط افسوس ہے — لکھنؤ اب ہم سے لاکھوں کوس ہے
اس سے بہتر سمجھیئے اب قصد دور — جاکے پڑھئے کیوں نہ ایسے کے حضور
وصف جس کا خارج از تحریر ہے — بار واں جس کو ملا سو میر ہے
مرتفع خود اس کا پایۂ جاہ ہے — نردبانِ فہم واں کوتاہ ہے
کون ہے وہ صاحبِ جود و نوال — قدر دانِ زمرۂ اہلِ کمال
میر عالم صاحبِ فیضِ عمیم — ورثہ دارِ آیۂ خلقِ عظیم
قضا سب یکسو امارت یک طرف — دولت یک جانب وزارت یک طرف
سرو سے از دودۂ اہلِ قبول — سیّدے از زمرۂ اہلِ رسول
استغفاب یہ بھی ہے جائے گزاف — اس جگہ پہنچا ہے مداحی کا لاف
کیوں سیادت کی جو حد جاہ ہے — آگے تو پھر اللہ ہی اللہ ہے
اے کریم الذات والا اقتدار — سید برحق امامِ نامدار
کس طرح کھولوں زبانِ التماس — دور باشِ جاہ سے گم ہیں حواس
ہے ادب کہتا نہ بڑھ مار تو — کہتی ہے جرأت نہ ہمت ہار تو

گو یہ فدوی سو بہمو مرہون ہے
قبلہ گاہا یہ صلہ جنون ہے

مجاہد کمال خاں

آسامی بنگالی اور اُڑیہ میں عربی و فارسی الفاظ

رسالہ آجکل کے ایک شمارے میں محمد اجمل خاں صاحب نے کشمیری اور گجراتی زبانوں
ان فارسی و عربی لفظوں کو بتایا ہے جو ان زبانوں میں گھل مل کر ایک جان ہو گئے ہیں اور کہیں
کسی قدر اصلی معنی اور تلفظ سے بھی دور ہو گئے ہیں۔ لیکن ان کی صورت اور ماخذ صاف بتاتی ہے
کہ یہ لفظ عربی فارسی کے ہیں۔ یہ دونوں ہندوستان کی مغربی انڈو آرین زبانیں تھیں۔ موجودہ
میں شمال مشرقی ہند کی جن تین انڈو آرین زبانوں کا ذکر ہے وہ آسامی، بنگالی اور اُڑیہ ہیں۔ یہ تینوں
بہار کی بیتھیلی (مگدھی پراکرت) یعنی مگدھ کی عوامی زبان کی بیٹیاں ہیں۔

آسامی

آسام (کام روپ) ہندوستان کی شمالی مشرقی ریاست ہے۔ اصل میں یہ لفظ اَسَم ہے
یعنی ناہموار۔ یہاں دریا اور پہاڑ بہت ہیں اس لئے یہ نام پڑا۔ تقسیم ہند سے پہلے اس کا رقبہ
ریاست منی پور کے ۶۷ ہزار میل سے اوپر تھا۔ اور ۱۹۴۱ء میں اس کی آبادی ایک کروڑ تھی
یہاں مختلف پہاڑیاں مختلف قبائل کے نام سے مشہور ہیں۔ مثلاً گارو، کھاسی
میری، ڈھپلا، منمی، کھمٹی وغیرہ۔ ہر قبیلہ کی زبان الگ ہے۔ چوں کہ ملک زرخیز ہے اس
قرب و جوار کے صوبوں سے بنگالی، بہاری اور اُڑیہ بھی آکر آباد ہو گئے ہیں۔ اور کل آبادی کا
حصہ ہیں۔ ۱۹۳۱ء میں ۳۴ فی صدی آبادی بنگالی زبان، ۲۲ فی صدی آسامی زبان
تبتی اور برمی بولتے تھے۔ یہاں ایک سو بیس مختلف زبانیں ہیں۔ جن میں سے ساٹھ خاص
کی ہیں۔ اور انڈو آرین ہیں۔

آسامی اور بنگالی زبانیں بہت زیادہ ملتی جلتی ہیں اور ان کا رسم خط بھی تقریباً ایک

ایک زمانے تک بنگالی زبان ہی سرکاری اور عدالتی زبان تھی۔ لیکن ۱۸۷۳ء م سے آسامی زبان عدالتی قرار پا گئی ہے ۔ بنگالی اور آسامی کی گرامر بھی بہت کچھ مماثل ہے ۔ اس میں سنسکرت کے خالص (تت سم) لفظ نہیں ہیں۔ بلکہ عوامی سنسکرت یعنی تدبھو الفاظ بہت ہیں۔ چوں کہ مسلمانوں کی حکومت یہاں تک نہیں پہونچی اس لئے جو فارسی اور عربی کے الفاظ وہاں پہنچے ہیں وہ بنگالی اور ہندی بولنے والوں کے ذریعہ گئے۔ ابتدائے تاریخ میں یہاں کرشن اور شیو کے ماننے والوں میں بہت بخشا بخشی تھی۔ ۶۰۰ء م سے ادہم راجاؤں کی حکومت کا پتہ چلتا ہے۔ جو برما سے بدھ مذہب لے کر آئے تھے اور پھر ہندو تہذیب اختیار کرلی تھی۔

یہاں کے دو بڑے شہروں یعنی گوہاٹی اور شیلانگ میں ہندوستانی زبانوں کے ذریعے سے قبائلی، آسامی اور بنگالی ایک دوسرے سے گفتگو کرتے ہیں۔ ہندی زبان کو یہاں ترقی کا بڑا موقعہ ہے عیسائی مشنریوں نے یہاں بہت کام کیا ہے ۔ ۱۸۱۹ء م میں انجیل کا ترجمہ اور ۱۸۶۷ء م میں آسامی لغت تیار کی ہے۔ ہیم چندرا بروانے "کنیارکیرتن" (افیون خوری کی برائی) میں ایک ڈرامہ لکھا' اور پروھتوں کی ریاکاری پر ایک ناول لکھا۔

عہد جدید میں حقیقت نگاری پر زیادہ توجہ ہے اور اجتماعی شعور زیادہ بیدار ہورہا ہے "جنتن دادارا" نے رباعیات عمر خیام کا ترجمہ کیا ہے اور کہانیوں' ناولوں اور تفریحی لٹریچر کی کمی نہیں ہے۔

آسامی زبان میں عربی و فارسی الفاظ مندرجہ ذیل ہیں

الف ـــــ ع

انگریز۔ انجن ۔ اکبر۔ عقل ۔ اذان ۔ ادب ۔ عدالت ۔ انار ۔ اندر ۔ انداز ۔ افسوس ۔ افیم ۔ عبیر۔ عملہ ۔ امانت ۔ اعمال نامہ ۔ ایمن ۔ امیر۔ عربی ۔ عرق ۔ عرض۔ عوض۔ البتہ ۔ علیحدہ ۔ اللہ ۔ اشرفی ۔ اسباب ۔ اثر ۔ اصل ۔ آسامی ۔ آثار ۔ اصطبل ۔ استر استین احمق ۔ آئندہ ۔ آئین ۔ آئینی ۔ آتا ۔ آخر ۔ آزاد ۔ آزار ۔ آتش بازی ۔ عادت ۔ آدم ۔ آدمی ۔ آداب ۔ آفت ۔ آبکاری ۔ آب خورہ ۔ آب دار ۔ آبرو ۔ آباد ۔ آبادی ۔ آب وہوا ۔ آمد ۔ آدام ۔ عالم ۔ عالی شان ۔ آواز ۔ آوارہ ۔ آسمان ۔ آسان ۔ آہستہ ۔ اقرار ۔ اقرار نامہ ۔ اختیار ۔ اختیار نامہ

اجلاس۔اظہار۔ اجارہ نامہ۔ اجارہ ۔عزت۔ انکار۔ انسان ۔انعام۔ امام۔علاقہ۔اشارہ۔اشتہار۔
استعفیٰ۔ اسلام ۔عید۔ ایمان دار۔ عذر۔امید۔ امیدوار۔عمر۔علماء ۔ استاد۔ ایک۔ایکطرفہ۔
ایک رنگ۔ اعلان ۔عیش ۔عورت۔

ق ـــ ک ـــ خ

قصبہ۔قتل۔ قدم۔ قدر۔ کفن ۔کباب ۔قہوہ۔ قبضہ۔قبر۔قبرستان ۔ کم۔کمزور۔کمر۔
قمیض۔کربلا کرامت۔کرامتی۔ قرار۔قلعی۔ قلم قسم۔کسرت۔قصائی۔قصائی خانہ۔قصور۔کاغذ۔
قاضی۔قانون۔قانون گو۔کافر۔کافی۔کافور۔قابو۔قایم۔قاعدہ۔کاروبار۔کارسازی۔کاریگری۔
کاریگر۔کتاب۔کنارہ۔کفایت۔کم خواب۔قلعہ۔کشمکش۔کشتی۔قسط قسم۔قسمت۔قیمت۔
قیمتی۔قربانی قینچی۔قید۔قیدخانہ۔قہوہ۔کیفیت۔قورمہ۔خنجر۔خزانچی۔خزانہ۔خط۔ختنہ۔ختم۔
خطرہ۔خبر۔خبردار۔خیال۔خیالی۔خرچ۔خرچی۔خربوزہ۔خراب۔خرابی۔خرید۔خریدار۔خلاص۔
خلیفہ۔خصلت۔خاکی۔خاطر۔خان۔خانساماں۔خانہ۔خانہ تلاشی۔خانہ شماری۔خواہ مخواہ۔
خام خیالی۔خاموش۔خار۔خارج۔خالی۔خاص۔خطاب۔خدمت۔خلوت۔خلاف۔خلافت
خود۔خدا۔خداغضب۔خداوند۔خوراک۔خوش۔خوشی۔خوشامد۔خون۔خونی۔خوب۔
خوبصورت۔خوبانی۔

غ ـــ گ

گز۔غزل۔غفلت۔غریب۔غرور۔غرض۔گردن۔گرمی۔غذا۔غالیچہ۔گرفتار۔
غلاف۔گناہگار۔گناہ۔گماشتہ۔گنبد۔گلزار۔گلزاری۔گلاب۔غلام۔گلوبند۔غسل۔غسل خانہ۔
غصہ۔گینڈا۔غیرآباد۔غیرحاضر۔گوشت۔

چ

چرخا۔چشمہ۔چادر۔چابک۔چار۔چارپائی۔چراغ۔چغہ۔

ج ـــ ز ـــ ظ ـــ ض

جنگ۔زنجیر۔زخم۔جزیہ۔زنانی۔جناب۔زبان۔جمع۔جماعت۔زمانہ۔زمین دار۔
زمین۔زراعت۔جریب۔زردہ۔جلدی۔جوان۔جوانی۔جواب۔جواہر۔جواہرات۔ظہیر۔جہان۔

جہان پناہ ۔ جہاز ۔ جہازی ۔ جاگیر ۔ جاگیردار ۔ جادو ۔ جادوگر ۔ جان ۔ جانور ۔ ضابطہ ۔ جامہ ۔ ضامن ۔
جعلسازی ۔ ظالم ۔ ظاہر ۔ جاہل ۔ جگر ۔ ضد ۔ جن ۔ جنس ۔ جرح ۔ ضلع ۔ جلد ۔ زمین ۔ زیرہ ۔ جدا ۔
جمعہ ۔ جلّاب ۔ ظلم ۔ جیب ۔ زور ۔ زوردار ۔ زیادتی ۔ زیادہ ۔

ت ـــــ ط

تجارت ۔ تدبیر ۔ تن ۔ تفسیر ۔ طبلہ ۔ تباہ ۔ تباہی ۔ تحفہ ۔ تمک ۔ تمام ۔ تماشہ ۔ ترکیب ۔ ترجمہ ۔
طرف ۔ طرف دار ۔ طرح ۔ ترازو ۔ طلب ۔ تلوار ۔ طلاق ۔ تلاش ۔ تحقیقات ۔ طاق ۔ طاقت ۔ تاکید ۔
تابعدار ۔ تاریخ ۔ تعریف ۔ تعلیم ۔ تعویذ ۔ تاثیر ۔ تیر ۔ تو ۔ طوفان ۔ تیز ۔ تیار ۔

د

دغاباز ۔ دفعہ ۔ دفتر ۔ دفتری ۔ دم ۔ در ۔ درکار ۔ درخواست ۔ درگاہ ۔ دربان ۔ دربار ۔
درباری ۔ دھاوا ۔ دروازہ ۔ دراز ۔ دریا ۔ دریافت ۔ داروغہ ۔ درزی ۔ درد ۔ دالانا ۔ دلّال ۔ دلّالی ۔
دلیل ۔ دوا ۔ دواخانہ ۔ دوات ۔ دوات دان ۔ دستہ ۔ دستانہ ۔ دستاویز ۔ دستور ۔ داخل ۔ داغ ۔
داغی ۔ داد ۔ دانہ ۔ دارا ۔ دارو ۔ دعویٰ ۔ دقّت ۔ دماغ ۔ دل ۔ دلخوش ۔ دل دار ۔ دیوانہ ۔ دیوان ۔
دیوانی ۔ دیوان عام ۔ دیوان خاص ۔ دعا ۔ دکان ۔ دنیا ۔ دوبارہ ۔ درست ۔ دور ۔ دوست ۔ دوستی ۔
دولت ۔

ن

نقد ۔ نقل ۔ نظر ۔ نظیر ۔ نذرانہ ۔ نظربند ۔ نفرت ۔ نفع ۔ نمک ۔ نمک دانی ۔ نمک حرام ۔
نمونہ ۔ نوّاب ۔ نشہ ۔ نصیب ۔ نہر ۔ ناقص ۔ ناخن ۔ ناظر ۔ ناپسند ۔ نابالغ ۔ نابود ۔ نامنظور ۔ نام ۔
نامزد ۔ نامی ۔ نایاب ۔ ناراض ۔ نالائق ۔ نالش ۔ ناشتہ ۔ ناحق ۔ نکاح ۔ نظام ۔ نشان ۔ نشانی ۔
نہایت ۔ نیلا ۔ نقصان ۔ نیک ۔ نوجوان ۔

پ

پنجا ۔ پنیر ۔ پردہ ۔ پروانہ ۔ پری ۔ پشم ۔ پشمی ۔ پشمینہ ۔ پسند ۔ پائجامہ ۔ پٹھان ۔ پنجرا ۔
پستہ ۔ پیشکش ۔ پیشکار ۔ پیشہ ۔ پیشاب ۔ پیشاب خانہ ۔ پیغامبر ۔ پیغام ۔ پیدا ۔ پوشاک ۔

ف

فصل ۔ فتویٰ ۔ فتح ۔ فرار ۔ فریاد ۔ فریادی ۔ فرشتہ ۔ فرق ۔ فرد ۔ فرمان ۔ فرمایش ۔ فلان ۔

نفس۔ فساد۔ فانوس۔ فارس۔ فالتو۔ فالودہ۔ فقرہ۔ فکر۔ فرنگی۔ فیتہ۔ فرصت۔ فیصلہ۔ فوج۔
فوجداری۔ فوجی۔ فوراً۔

ب

بخشش۔ بخش۔ بغل۔ باغیچہ۔ بدن۔ بدنامی۔ بدمعاش۔ بانات۔ بنام۔ بندگی۔ بندرگاہ
بندی۔ بندوق۔ بندوبست۔ بیعانہ۔ برکت۔ برخواست۔ برت۔ برباد۔ برآمدہ۔ برفی۔ باورچی
بستہ۔ بستی۔ بہادر۔ بہادری۔ بہار۔ بہشت۔ باقی۔ باغ۔ باز۔ بازار۔ بازی۔ بازیگر۔ بازو
بیعہ۔ بادام۔ بابت۔ بابا۔ باشندہ۔ بیچارہ۔ بالکل۔ بیمار۔ بنیاد۔ بنیادی۔ بلبل۔ بے ادبی۔
بجائے۔ بیزار۔ بیدخل۔ بینام۔ بیہودہ۔ بیہوش۔

م

منزل۔ منظور۔ مکتب۔ مکان۔ محل۔ مفرور۔ مغز۔ مزدور۔ مزدوری۔ مضبوط۔ مجلس
مزا۔ مطلب۔ مدد۔ مدرسہ۔ منصبدار۔ مرمت۔ مرہم۔ مرض۔ مرد۔ مسجد۔ مسودہ۔ مسالہ۔ مت
مقبول۔ محکمہ۔ محل۔ مخذ۔ محصول۔ معتبر۔ معاف۔ معاملہ۔ معمولی۔ موقوف۔ مالک۔ مالش۔ معلم
میعاد۔ مزاج۔ مینا۔ میناکاری۔ مینار۔ منشی۔ مقدمہ۔ مقابلہ۔ مقام۔ مختار۔ منصف۔ منافع۔ مفقود
مفت۔ مربی۔ مرغ۔ ملک۔ ملتوی۔ ملاقات۔ مشکل۔ مسافر۔ مصیبت۔ محبت۔ مہتر۔ محنت۔
مہمان۔ مہربانی۔ میدا۔ میدان۔ موزہ۔ موم۔ موجود۔

ر

رنگ۔ رنگین۔ رقم۔ رکاب۔ رفیع۔ رباب۔ روانہ۔ رسد۔ رسید۔ راضی۔ راست
رشوت۔ رہائی۔ رومال۔ ریشم۔ ریشمی۔ روز۔ روزگار۔ روزی۔ روش۔ روشنی۔

ل

لگام۔ لفظ۔ لشکر۔ لائق۔ لاش۔ لفافہ۔ لحاف۔

و

وکیل۔ وقت۔ وزن۔ وزیر۔ وجوہات۔ ورثا۔ وصول۔ ودائی۔

ش

شراب۔ شربت۔ خرابی۔ شریر۔ خربوزہ۔ خرم۔ شلغم۔ شہر۔ شاہ۔ شادی۔ شاباش۔

شامیانہ۔ شامل۔ شاہ۔ شاہزادہ۔ شکار۔ شکاری۔ شیشہ۔ شروع۔ شیطان۔

ص ـــ س ـــ ث

سنجاف۔ صندوق۔ صدر۔ سند۔ سفر۔ ثبوت۔ سبز۔ سبزی۔ سرکار۔ سرزمین۔ سردار۔
سربراہ۔ سوائے۔ سررشتہ۔ سررشتہ دار۔ سردی۔ سلام۔ صاف۔ صابون۔ سپاہی۔ سفارش۔
صبح۔ صوفی۔ صوبہ۔ صوبہ دار۔ سوداگر۔

ح ـــ ہ

ہنگامہ۔ حق۔ حق دار۔ حاکم۔ ہضم۔ حضرت۔ ہزار۔ حضور۔ حجّام۔ حد۔ ہفتہ۔ حیات۔
حرکت۔ ہردم۔ حرم۔ حرام۔ حمام خور۔ حرامزادہ۔ حرامی۔ حرف۔ حلوہ۔ حلوائی۔ حلال۔ حلف۔
ہوس۔ ہوا۔ ہوائی۔ حاکم۔ حاجت۔ حاضر۔ حاضری۔ حاجی۔ حافظ۔ حالت۔ حاصل۔ ہمّت۔
حکم۔ حقّہ۔ حرمت۔ ہیضہ۔ حیوان۔ ہوشیار۔

بنگالی

ریاست بنگال ہندوستان کی وہ ریاست ہے جہاں شہر کلکتہ ہے، اور جسے مشرق کا لندن کہتے ہیں۔ اس کے مشرق میں آسام، مغرب میں بہار اور اڑیسہ اور شمال میں نیپال ہے۔ تقسیم ہند سے پہلے اس کا رقبہ ۸۲ ہزار مربع میل سے زیادہ اور آبادی ۶ کروڑ سے اوپر تھی۔ ۱۹۱۲ء تک بہار اور اڑیسہ اس صوبے میں داخل تھے۔ اس لئے ہندوستانی اور اڑیہ زبانوں پر بنگالی کا اور بنگالی زبان پران کا اثر اب تک باقی ہے۔

آب و ہوا نہایت مرطوب ہے، اس لئے لوگ جسمانی محنت کے عادی کم ہیں۔ چاول اور پٹ سن یہاں بہت ہوتا ہے اور دارجلنگ وغیرہ میں عمدہ چائے ہوتی ہے۔

ساتویں صدی تک یہاں بدھ مذہب تھا پھر ہندو مذہب سے کشمکش شروع ہوئی اور سب ہندو ہو گئے۔ چاٹگام میں چند لاکھ بدھ مذہب کے لوگ باقی ہیں۔

جب ۱۱۹۹ء میں بختیار خلجی نے بنگال فتح کرلیا تو ملکی زبان یعنی بنگالی کو ترقی ہوئی اور خصوصیت سے ۱۵۴۰ء کے بعد پٹھانوں کی سلطنت میں بنگالی زبان فارسی رسم الخط میں لکھی گئی۔ پدماوت کا ترجمہ ہوا۔ اور علاول شاعر مشہور ہوا۔ ۱۷۶۵ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا زمانہ آیا۔

انگریزی زبان کے اثرات بڑھے۔ اور سنسکرت کے عالموں نے بھی سنسکرت آمیز بنگالی میں لکھنا شروع کیا۔ یورپین علوم بھی بنگالی میں منتقل ہوئے اور خود بنگالی مصنفین مثلاً بنکم چندر کی کتابیں دوسری زبانوں میں ترجمہ ہوئیں۔ شاعر رابندر ناتھ ٹیگور کے زمانے تک فارسی زبان کا چرچا تھا۔ اور عدالت و کاروبار میں فارسی اصطلاحات عوام میں جاری تھیں ٹیگور نے عوامی زبان میں لکھنا شروع کیا، جس کا یہ نتیجہ ہے کہ بنگالی زبان اڑیسہ، آسام اور بہار تک سمجھی جانے لگی۔

بنگالی زبان کی دو بولیاں ہیں۔ ایک مغربی اور دوسری مشرقی۔ مشرقی زبان کو مسلمانی بنگلہ بھی کہتے ہیں۔ اور دونوں بولیوں میں کافی اختلاف پایا جاتا ہے۔ تلفظ کے اعتبار سے مشرق میں ھا کو الف سے بدل دیتے ہیں جیسے ہم کو آم۔ اور جیم کو "ز" سے جیسے حاجی کو حازی کہتے ہیں۔ ایسے ہی کاف کو سین سے بدل دیتے ہیں جیسے کام کو "سام" وغیرہ۔ علمی بنگالی میں تت سم یعنی خالص سنسکرت الفاظ زیادہ ہوتے تھے۔ یہ رجحان ٹیگور کے بعد سے کم ہو رہا ہے، لیکن نئی ہندی کو عام کرنے کے حامی پھر سنسکرت کو قدیم جگہ پر لانا چاہتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ بنگالی زبان پراکرت کی بیٹی ہے سنسکرت کبھی عوام کی زبان نہیں تھی نہ ہے اسی لئے اسے مگدھی پراکرت سے ماخوذ مانا جاتا ہے۔ اس زبان میں دوسری زبانوں کے لفظوں کو جذب کرنے کی کافی صلاحیت ہے۔ فارسی کی طرح اس میں تذکیر و تانیث کا جھگڑا نہیں۔ اردو اور ہندی اسماء و افعال دونوں میں تذکیر و تانیث موجود ہے اور وہ بھی کسی خاص اصول پر مبنی نہیں، لہذا اصول پرست بنگالیوں نے تقسیم ہند کے بعد بھی اپنی زبان کو تقسیم نہیں کیا اور دونوں ملکوں کے بنگالوں میں بنگالی ہی سرکاری زبان ہے۔

کانگرس نے قوم پرور تحریک میں بنگالی کی اولیت کو مان لیا تھا۔ اس لئے کل ہند کانگرس نے بنکم چندر کا ترانۂ ملی اپنا ترانہ قرار دیا تھا۔ تقسیم ہند کے بعد شاعر رابندر ٹیگور کا بنگالی قومی ترانہ (جن۔ من۔ گن) ہندوستان کا سرکاری قومی ترانہ مان لیا گیا ہے۔ اس میں اب تک وحدت ملی کا تصور باقی ہے یعنی پنجاب، سندھ اور بنگال تینوں صوبے مکمل موجود ہیں۔

بنگالی زبان میں عربی و فارسی الفاظ مندرجہ ذیل ہیں۔

الف ــــــ ع

انجام۔ عقل۔ عقلمند۔ اکثر۔ اخبار۔ عجب تماشا۔ اذان۔ عجیب۔ ادا۔ عدالت۔
انار۔ افسوس۔ افیم۔ ابر۔ امین۔ امیر۔ عرق۔ عوض۔ عرضی۔ البتہ۔ علیحدہ۔ اسباب۔ اثر۔
اصیل۔ احمق۔ احوال۔ آیندہ۔ آئینہ۔ آخر۔ آخری۔ آزاد۔ آزادی۔ آتش۔ آتشبازی۔
آتشی۔ عادت۔ آدم۔ آدمی۔ آفت۔ آبخورہ۔ آبلہ۔ آب ہوا۔ آبادی۔ آمدنی۔ آمادہ۔ آواز۔
اشرفی۔ آسمان۔ آستین۔ انتقال۔ انتظام۔ انتظار۔ انصاف۔ اجلاس۔ اظہار۔ ازار۔
اجارہ۔ اجارہ دار۔ عزت۔ اطلاع۔ انعام۔ عمارت۔ اشتہار۔ اشارہ۔ استعفیٰ۔ عید۔
استعمال۔ ایمان۔ ایمان دار۔ عمر۔ اُمراء۔ اُمید۔ اُستاد۔ اوقات۔ اولاد۔

خ ــــ ق ــــ ک

قتل۔ قدم۔ قبضہ۔ قبر۔ قبرستان۔ کبوتر۔ کبوترخانہ۔ قبول۔ کم۔ قمیض۔ کمبخت۔
قرض۔ قرضدار۔ قلندر۔ قلم۔ قلمدان۔ قلب۔ تصور۔ کاغذ۔ قانون۔ قانون گو۔ قاعدہ۔
کاریگر۔ کاہل۔ کتاب۔ کنارہ۔ قلعہ۔ قلعہ دار۔ قسط۔ قسم۔ قسمت۔ قُرق۔ قربانی۔ قینچی۔
قید۔ کیفیت۔ خنجر۔ خزانچی۔ خزانہ۔ خط۔ ختم۔ خبردار۔ خمیرہ۔ خیانت۔ خرگوش۔ خراب۔ خرید۔
خربوزہ۔ خریدار۔ خرچ۔ خلیفہ۔ خاص۔ خصم۔ خستہ۔ خاک۔ خاکی۔ خاطر۔ خانگی۔ خانساماں۔
کھاناخرچ۔ خانہ تلاش۔ کھاناپینا۔ خاندانی۔ خام۔ خواہ مخواہ۔ خام خیالی۔ خار۔ خارج۔
خالی۔ خواہش۔ خطاب۔ خدمت۔ خلاف۔ خود۔ خدا۔ خوراک۔ پوشاک۔ خورد۔ خوش۔
خوشبو۔ خوش مزاج۔ خوشامد۔ خوشی۔ خشکی۔ خون۔ خوب۔ خیرات۔ خیراتی۔ خیال۔
خواب۔ خوابگاہ۔

غ ــــ گ

گز۔ غزل۔ گردن۔ غریب۔ گرمی۔ غلط۔ غلطی۔ غالیچہ۔ گواہ۔ غازی۔ غایب۔ گرفتار۔
گناہ۔ گم۔ غل۔ گلاب۔ گلابی۔ غلام۔ غلامی۔ غسل۔ غصہ۔ غیرحاضر۔ گوینده۔

ج

چراغ۔ چیز۔ چُست۔

ج ـ ز ـ ذ ـ ض ـ ظ

جنگل۔جنگلی ۔زنجیر۔زخم۔زخمی۔ زنانہ۔جناب ۔ زبردستی۔ ذبح ۔زبان ضبط۔
جمع خرچ ۔ زمیندار ۔ زمین ۔ زراعت ۔ زری ۔جریب ۔ مزدور ۔ ضرورت۔ضروری جلوس۔
جلدی۔جلسہ۔جوان ۔جواہرات۔جہنم۔ظہر۔ جہاز۔جاگیر۔ جاگیردار۔ جادوگری۔جان۔
جانور ۔ زعفران۔جامہ۔ ضامن جعل ۔ ظاہر۔ زندگی۔زندہ۔ جگر۔ ضد۔ضدی جنس۔
زمہدار۔ضلع۔ جلا۔جدا۔ جمعہ۔ظلم۔جیب ۔ زور۔جوش۔ زیادتی۔ زیادہ۔

ت ـ ط

تنگ۔ تقدیر۔تکلیف ۔تقاضہ۔ تخت پوشش ۔تدبیر۔تن۔ تنخواہ۔تفسیر۔
طباق۔طبلچی۔طبلہ۔طبیعت ۔ تمسک ۔تمام ۔تماشہ۔ ترکیب ۔طرف۔ تربوز۔ترازو۔
ترجمہ۔طلب ۔تلوار۔طلاق۔تلاشش ۔ تصوّف۔تصویر۔ تحویل ۔تحویلدار۔تحصیل ۔
تحصیل دار۔ طاق ۔طاقت ۔ تاج ۔ تازہ۔ تعزیہ ۔تعجب ۔ تار۔ تارہ۔ تاریخ۔تعلق۔
تعویذ۔تجارت۔ تفنگ۔تیزی۔تیار۔

د

دخل۔ دخلی۔دغاباز ۔ دجال۔ دفتر۔ دفتری۔ درکار۔ درخواست۔درگاہ۔دربان۔
دربار۔دروازہ ۔ دراز۔ دریا۔ درزی۔ درد ۔دلیل ۔ دوائی۔ دواخانہ۔دوات۔دستخط۔
دستہ۔دستانہ ۔ دستاویز۔ دستور۔ داخل ۔ داخلہ ۔داغ۔دارو۔ دق ۔ دماغ۔دل۔
دل خوش ۔دیگر ۔ دیوار ۔ دنیا۔ دنیادار ۔ دنیاداری۔ درست ۔دشمن۔ دکان ۔ دور۔
دوربین ۔ دوست ۔ دولت ۔

ن

نقد۔نقل۔نقل نویس۔نقیب۔ نقشہ ۔نزدیک ۔نظر۔نظربند ۔نظربندی۔ نذرانہ۔
نظیر۔نمونہ۔نرم۔ نواب ۔ نواب زادہ۔ نوابی ۔ نشہ۔ نشہ خور۔ نصیب۔نہر۔ناقص۔
ناخدا۔ ناظر۔ نابالغ ۔ نامنظور۔ نام۔نایاب۔ ناراض۔نظام ۔ نظامت۔ نمک۔
نرخ۔نشان۔نیم راضی۔نقصان۔نور

پ — ف

پردا۔ پلاؤ۔ پیش۔ پیشہ۔ پیشاب۔ پیشہ دار۔ پیغامبر۔ پیدل۔ پیدا۔ پوشاک۔
پارہ۔ پیالہ۔ فقیر۔ فتح۔ فرمایش۔ فریاد۔ فریادی۔ فرق۔ فرد۔ فصل۔ فصلی۔ فاضل۔
فانوس۔ فائدہ۔ فالتو۔ فکر۔ فیتہ۔ فیروزہ۔ فیل خانہ۔ فرصت۔ فہرست۔ فیصلہ۔
فوجدار۔ فوج۔ فوجداری۔

ب

بیجا۔ برواز۔ بروانہ۔ برداہ۔ بندگی۔ بندہ۔ بندش۔ بندوق۔ بندوبست۔
بقرعید۔ بقایا۔ بخشی۔ بغل۔ باغیچہ۔ بدخط۔ بد۔ بدخیال۔ بدنام۔ بدمعاش۔ بدمعاشی۔
بدمزاجی۔ بدہضمی۔ بنام۔ برباد۔ برقنداز۔ برخاست۔ برداشت۔ برف۔ برفی۔ باربار۔ بس۔
بستہ۔ بستی۔ بہادر۔ باقی۔ باغ۔ باغبان۔ بازار۔ بازی۔ بازو۔ بازوبند۔ باطل۔ بعد۔
بادشاہ۔ بادام۔ بادامی۔ بانٹ۔ بابت۔ بابا۔ بارگاہ۔ بارود۔ بالشت۔ باورچی۔ باشندہ۔
بالکل۔ بسم اللہ۔ بیمار۔ برج۔ بلبل۔ بے اختیار۔ بے ادب۔ بے ایمان۔ بے قاعدہ۔ بے کار۔
بےغم۔ بے چارہ۔ بے دم۔ بے فائدہ۔ بے باق۔ بے وقوف۔ بے شرم۔ بیشتر۔ بے حد۔
بےحال۔ بےہوش۔

م

منزل۔ منظور۔ مکان۔ مکتب۔ مخمل۔ مزدور۔ مضبوط۔ مجلس۔ مجلسی۔ مذاق۔ مطلب۔
مرو۔ منصب۔ مرد۔ مرمت۔ مرہم۔ مرضی۔ مشغول۔ مشغل۔ مشعلچی۔ مشق۔ مسند۔ مسودہ۔ مسالہ۔
مسجد۔ مستول۔ محل۔ محلہ۔ محصول۔ معاف۔ معاملہ۔ معمولی۔ معرفت۔ مالدار۔ مالک۔ مالش۔ معلوم۔
مزاج۔ میعاد۔ مینا۔ مینار۔ منشی۔ منافق۔ مقدمہ۔ مختار۔ مخل۔ مطابق۔ منقہ۔ منافع۔ مفت۔
مربع۔ مردہ۔ ملاقات۔ ملایم۔ ملک۔ ملتوی۔ موکل۔ مشکل۔ مسلمان۔ مسافر۔ مصاحب۔ میوہ۔ مہتر۔
مہمان۔ مہربانی۔ میدان۔ معتبر۔ موقع۔ موت۔ موروثی۔ مولوی۔ مولانا۔ موسم۔

ی

ر

رنگ۔ رنگین۔ رقم۔ رعیت۔ رسید۔ راضی۔ راہ۔ راہ خرچ۔ رہزن۔ رعایت۔
رکاب۔ رواج۔ رومال۔ ریشم۔ روز۔ روزگار۔ روزنامہ۔ روزہ۔ روشنائی۔ روشنی

ل

لفافہ۔

و

وکالت نامہ۔ وکیل۔ وقت۔ وزن۔ وجوہات۔ واپس۔ وداع۔ ولایت۔ ولایتی۔

س۔ ش۔ ص۔ ث

شراب۔ شریک۔ شریف۔ شربت۔ شرط۔ شربت۔ شرم۔ شلجم۔ شہر۔ شاہد۔ شاگرد۔
شادی۔ شامیانہ۔ شائستہ۔ شال۔ شاہ۔ شکار۔ شکاری۔ شناخت۔ شیشہ۔ شیخ۔ شیر۔
شیطان۔ صندوق۔ صد۔ صدر۔ سفر۔ صفائی۔ سفید۔ ثبوت۔ سبز۔ صبر۔ سرکار۔ سرکاری۔ سردار۔
شرم۔ سرد۔ سردی۔ سلام۔ سلامی۔ صلاح۔ سادہ۔ صاف۔ سابق۔ سال۔ سالانہ۔ سفارش۔
سرنامہ۔ سُرمہ۔ سراغ۔ سلطان۔ صوبہ۔ صوبیدار۔ صورت۔

ح ــــ ہ

حق۔ حقدار۔ حقیقت۔ حاکم۔ حج۔ ہضم۔ حضرت۔ حجام۔ ہزار۔ حد۔ ہفتہ۔ ہمیشہ۔ ہر۔
ہردم۔ حرف۔ ہرروز۔ ہروقت۔ حرام۔ حرام زادہ۔ حرامی۔ حلف۔ حلوہ۔ حلوائی۔ ہوا۔
حاجت۔ حاضر۔ حاجی۔ حال۔ حالت۔ حاشیہ۔ حاصل۔ حکمت۔ حفاظت۔ ہمت۔ حساب۔
حصہ۔ حصہ دار۔ حکومت۔ حکم۔ حضور۔ حیران۔ حیرانی۔ ہوشیار۔

اڑیہ

اڑیسہ کو کالینگا اور اُتکل بھی کہتے ہیں۔ یہ ہندوستان کے قدیم ترین تمدن کی یادگار ہے۔ اس کا رقبہ ساٹھ ہزار مربع میل اور آبادی ڈیڑھ کروڑ سے اوپر ہے۔ یہاں اُڑیہ زبان بولی جاتی ہے۔ جو مگدھی پراکرت سے ماخوذ ہے۔ سرجان بیمس نے "ہندوستان کی جدید انڈو آرین زبانوں کی تقابلی گرامر" (ج۔ ۱۔ ص۔ ۱۲۰) میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اڑیہ ایک مستقل

زبان بن چکی تھی حالانکہ بنگال میں مشرقی ہندی کی بہت سی ناقص قسمیں جاری تھیں۔

اڑیہ رسم خط آرین اور دراوڑ رسوم خط کا خوش نما مرکب ہے۔ اور جس طرح لکھی جاتی ہے اس طرح بولی بھی جاتی ہے۔ اُڑیہ زبان کا لٹریچر بھی بہت وسیع ہے، لیکن ابھی تک بوجوہ اس کی کتابیں کثرت سے شائع نہیں ہو سکیں۔

اڑیہ زبان اگرچہ بہت قدیم ہے لیکن اس کا لٹریچر سولہویں صدی سے زیادہ پرانا نہیں۔ اڑیہ میں بھاگوت پران کا ترجمہ ہوا جس کا وہاں کے باشندوں پر بہت اثر ہے۔ اس زبان کی شاعری پنڈتوں کی سنسکرت آمیز زبان میں ہے، اس لئے عوام سے دور ہے پھر بھی بنگالی اور ہندی کے اثر سے عوامی زبان کی نثر و نظم کی ترقی ہو رہی ہے۔

اُڑیہ زبان میں عربی و فارسی الفاظ مندرجہ ذیل ہیں:

الف ــــ ع

انگریز۔ انگریزی۔ اندازہ۔ عقل۔ عقلمند۔ عدالت۔ عداوت۔ افیم۔ عمل۔ امانت۔ امانت دار۔ امانت نامہ۔ امین۔ امیر۔ عرضی۔ البتہ۔ علاوہ۔ اشرفی۔ اصل۔ اصطبل۔ احمق۔ آئین۔ آئین قانون۔ آئندہ۔ آخر۔ عادت۔ آبادی۔ آمدنی۔ آباد۔ آرام۔ آسمان۔ اجلاس۔ اظہار۔ اجارہ۔ عزت۔ عزت دار۔ انعام۔ علاقہ۔ علاقہ دار۔ علم۔ اشارہ۔ اشتہار۔ استعفیٰ۔ عرف۔ استاد۔ ایک۔

خ ــ ق ــ ک

قضیہ۔ قتل۔ قدم۔ قدر۔ قدردان۔ قنات۔ کباب۔ قبالہ۔ کبوتر۔ قبول۔ قبولیت۔ قبضہ۔ قبر۔ کم۔ کم اصل۔ کم زور۔ کمزوری۔ کمبخت۔ کمبختی۔ کمر۔ کمان۔ قمیص۔ قرار۔ قرارنامہ۔ قلم۔ قرض دار۔ قلم تراش۔ قلمدان۔ قلم پیشہ۔ قلمس۔ قسم۔ تصور۔ کاغذ۔ قاضی۔ قانون۔ قانون گو۔ قافلہ۔ قابل۔ قابو۔ قاعدہ۔ قائم۔ کارکن۔ کارخانہ۔ کارچوبی۔ کاریگر۔ کاروبار۔ کاشت۔ کاشتکار۔ قطعہ۔ کتاب۔ کنارہ۔ کمخواب۔ قلعہ۔ قلعہ دار۔ قسط۔ قسم۔ قسمت۔ قیمت۔ قیمہ۔ کیمیا۔ قیدخانہ۔ قیدی۔ کیفیت۔ قینچی۔ قید۔ خنجر۔ خندق۔ خچر۔ خزانچی۔ خزانہ۔ ختم۔ خفا۔ خبر۔ خبردار۔ خرگوش۔ خربوزہ۔ خواب۔ خرید۔ خریدار۔ خریف۔ خرچ۔ خلاصی۔ خصم۔ خستہ۔ خاکی۔ خاطر۔

خانگی۔ خاندان۔ خانہ تلاشی۔ خانہ پری۔ خام خیالی۔ خارج۔ خالی۔ خاوند۔ خاص۔ خدمت۔
خراج۔ خلوت۔ خلاف۔ خود۔ خودکاشت۔ خفیہ۔ خرما۔ خوراک۔ خوشبو۔ خوشامد۔ خوشامدی۔
خوش۔ خون۔ خونی۔ خوب۔ خیرخواہ۔ خیرات۔ خول۔ خیال۔ خواہ مخواہ۔

گ ــــ غ

گنجفہ۔ گز۔ غفلت۔ غرض۔ غریب۔ گرم۔ گرم مصالحہ۔ گرم مزاج۔ غلط۔ غالیچہ۔
غلیظ۔ گواہ۔ گشت۔ گرفتار۔ غلاف۔ گنجائش۔ گنبد۔ گناہ۔ گمان۔ گماشتہ۔ گلاب۔ گلابی۔
غلام۔ غلامی۔ غسل۔ غصہ۔ غیرت۔ غیر مضبوط۔ غیر واجب۔ غیر حاضر۔ غیر ہوشیار۔ گل انداز۔

چ

چمچہ۔ چشمہ۔ چاقو۔ چارجامہ۔ چارہ۔ چق۔ چیز۔ چست۔ چغہ۔

ذ ـ ز ـ ض ـ ج ـ ظ

زنگ۔ جنگل۔ جنگلی۔ زنجیر۔ زخم۔ جنازہ۔ زنانہ۔ زبردست۔ زبان۔ زبان دراز۔
ضبط۔ جمع۔ جمع خرچ۔ جماعت۔ جمعدار۔ جمعداری۔ ضمانت۔ زمین دار۔ زمین۔ ذریعہ۔ ندی۔
جریب۔ ضرورت۔ جوان۔ جواب۔ ظہر۔ جہاز۔ جاگیر۔ جاگیردار۔ زعفران۔ ضامن۔ جائداد۔
جاری۔ جال۔ جعل۔ ظالم۔ جاسوس۔ ظاہر۔ جگر۔ ضد۔ جنس۔ ذمہ۔ ذمہ دار۔ جرح۔ ضلع۔
جلد۔ زین۔ جزو۔ جرمانہ۔ جرم۔ زلف۔ جلاب۔ ظلم۔ جیب۔ زیربار۔ جو۔ جوہری۔ زیادہ۔

ت ـــ ط

تکیہ۔ تخت۔ تختہ۔ تجویز۔ تدبیر۔ تنخواہ۔ تفسیر۔ طلبہ۔ تمغہ۔ تمسک۔ تمام۔ تماشہ۔
تمباکو۔ تنبیہ۔ ترجمہ۔ ترتیب۔ ترازو۔ طلب۔ تلوار۔ تلاش۔ تصویر۔ تحویل۔ طاق۔ طاقت۔
تاکید۔ تاج۔ تازہ۔ تعجب۔ تار۔ تابع۔ تابعدار۔ تاریخ۔ تعریف۔ تعلیقہ۔ تعلیم۔ تعلقہ۔
تعویذ۔ تیرانداز۔ تیر۔ طوفان۔ تیار۔ تحفہ۔

د

دغا۔ دغاباز۔ دغابازی۔ دفعہ۔ دفتر۔ دفتری۔ درخواست۔ درزی۔ دربان۔
دربار۔ دریا۔ دریافت۔ درد۔ دلال۔ دلیل۔ دستخط۔ دستانہ۔ دستاویز۔ دستور۔ دستوری

داخل ۔ داغ ۔ داخلی ۔ دام ۔ دائر ۔ داروغہ ۔ دعویٰ ۔ دعوت ۔ دینار ۔ دیوان ۔ دکان ۔ دکاندار ۔
دنیا ۔ درست ۔ دشمن ۔ دوست ۔ دوبارہ ۔

ن

نقد ۔ نقل ۔ نقل نویس ۔ نقلی ۔ نقشہ ۔ نقاشی ۔ نزدیک ۔ نظر ۔ نظربندی ۔ نذرانہ ۔ نظیر ۔
نفر ۔ نفع ۔ نبی ۔ نمک ۔ نو ۔ نواب ۔ نشہ ۔ نصیب ۔ ناقص ۔ ناظر ۔ نازک ۔ نابالغ ۔ نامزد ۔ نایاب ۔
ناراض ۔ ناراضگی ۔ نسل ۔ ناشتہ ۔ نیت ۔ نیلام ۔ نشان ۔ نہایت ۔ نقصان ۔

پ ۔ ف

پتہ ۔ پیش ۔ پیشہ ۔ پوشاک ۔ پیدا ۔ پیالہ ۔ فقیر ۔ فضیحت ۔ فتح ۔ فیصلہ ۔ فوج ۔ فوجداری ۔

ب

بقایا ۔ بغل ۔ باغیچہ ۔ بغیر ۔ بد ۔ بدنامی ۔ بدمعاش ۔ بدمزاج ۔ بدصورت ۔ بانات ۔ بنام ۔
بیعنامہ ۔ بیان ۔ بیعانہ ۔ برقنداز ۔ برخواست ۔ برداشت ۔ برباد ۔ برادہ ۔ برف ۔ بستہ ۔
بہادر ۔ بہانہ ۔ بہار ۔ بحال ۔ باقی ۔ باک ۔ باغ ۔ باز ۔ بازار ۔ بازاری ۔ بازی ۔ بازیگر ۔ بازو ۔
بادشاہ ۔ بادام ۔ بالشت ۔ باشندہ ۔ بالکل ۔ بیماری ۔ بنیاد ۔ بنیادی ۔ بُرقع ۔ بُرنج ۔ بےعزّتی ۔
بے ایمان ۔ بیکار ۔ بےغم ۔ بےجا ۔ بےدم ۔ بےباق ۔ بیش ۔ بےشمار ۔

م

منظور ۔ محل ۔ مغز ۔ مضبوط ۔ مجلس ۔ مزہ ۔ مطلب ۔ مرض ۔ مرمر ۔ مرمّت ۔ مرد ۔ مرہم ۔
مشک ۔ مشعل ۔ مسخرہ ۔ مسجد ۔ مسالہ ۔ محکمہ ۔ محل ۔ محصول ۔ معاف ۔ معاملہ ۔ معمولی ۔ معرفت ۔ مالک ۔
مالکانہ ۔ مالش ۔ معلوم ۔ مزاج ۔ معائنہ ۔ مقدمہ ۔ مقابلہ ۔ مقام ۔ مطابق ۔ منصف ۔ منافع ۔ مرغ ۔ مربّہ ۔
مربّی ۔ مردہ ۔ مطبع ۔ ملک ۔ موکل ۔ مشکل ۔ مسافر ۔ محرّر ۔ مہلت ۔ محافظ ۔ میخ ۔ مہتر ۔ مہربانی ۔ میدان ۔ موزہ ۔
مہر ۔ موج ۔ موضع ۔ موروثی ۔

ر

رنگ ۔ رتبہ ۔ رقم ۔ رد ۔ رفع ۔ رفو ۔ رسد ۔ رسید ۔ رہزن ۔ راضی ۔ راہ ۔ رقعہ ۔ رومال ۔
ریشم ۔ ریشمی ۔ رعیت ۔ روز ۔ روزگار ۔ روزنامچہ ۔ روشنی ۔

ل

لنگور ۔ لگام ۔ لفافہ ۔

و

وکالت ۔ وکیل ۔ وقت ۔ وغیرہ ۔ وزن ۔ وصول ۔ وارث ۔ ولایت ۔ ولایتی

ش

شطرنج ۔ شربت ۔ شراب ۔ شریک ۔ شریر ۔ شرط ۔ شرم ۔ شمر ۔ شادی ۔ شاہد ۔ شاباش ۔
شامیانہ ۔ شامل ۔ شال ۔ شکار ۔ شکاری ۔ شیشہ ۔ شوق ۔ شوقین ۔

ث ـــ س ـــ ص

صندوق ۔ سخت ۔ سزا ۔ سفر ۔ سفید ۔ صبر ۔ سرنجام ۔ سرکار ۔ سرکاری ۔ سردار ۔ سرحد
سردی ۔ سلام ۔ سازش ۔ سادہ ۔ ثانی ۔ صاف ۔ صابون ۔ سال ۔ ثالث ۔ صاحب ۔ سپاہی ۔
سفارش ۔ سر ۔ صراحی ۔ سلطان ۔ سود ۔ صوبہ ۔ سورج ۔ سیب ۔ سودا ۔ سوداگر ۔

ح ـــ ہ

حق ۔ حق دار ۔ ہضم ۔ ہزار ۔ حد ۔ ہفتہ ۔ حرکت ۔ ہردم ۔ حرام ۔ حرف ۔ حلف ۔ حلوہ ۔
حلوائی ۔ ہلاک ۔ حاکم ۔ حاجت ۔ حاضر ۔ حاضری ۔ حال ۔ حالت ۔ حاصل ۔ حفاظت ۔ ہمت ۔
حساب ۔ حقہ ۔ حکم ۔ حیلہ ۔ ہیضہ ۔ حیوان ۔ ہوش ۔ ہوشیار ۔



مولانا ابوالکلام آزاد اور صدر یار جنگ

ریاض الرحمٰن شروانی

ابوالکلام آزاد
اور
نواب صدر یار جنگ بہادر کے تعلقات

امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد اور نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں
شروانی کے تعلقات سے عام طور پر لوگ غبار خاطر کی اشاعت سے پہلے بہت کم واقف
تھے۔ ان دونوں کی زندگی کے حالات و واردات میں جو تفاوت تھا اس کے پیش نظر
ایسا ہونا قدرتی تھا۔ مولانا کی زندگی کا سب سے اہم داعیہ جہادِ حرّیت کی گرم بازاری تھا
جب کہ نواب صاحب خاموش اور پُرسکون زندگی کے شیدائی تھے۔ نتیجے میں ایک کے
شب و روز کا کافی بڑا حصہ قید خانے کی چہار دیواری میں گزرا تو دوسرے کا ریاست
حیدرآباد کی مسندِ وزارت پر، لیکن دونوں کے درمیان ایک قدرِ مشترک ایسی تھی جو
دوسرے اختلافات پر حاوی رہی اور جس نے زندگی بھر کی ذہنی رفاقت اور قلبی تعلق
کی صورت اختیار کرلی۔ یہ قدرِ مشترک علمی ذوق اور ثقافتی ہم آہنگی تھی۔ دونوں کو
فارسی شعر و ادب سے گہرا لگاؤ تھا اور دونوں اپنے اپنے طور پر اسلامی ثقافت اور روایات
کے بہترین نمایندے تھے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے مولانا آزاد پر ایک مقالے میں بڑی
خوش اسلوبی سے ثابت کیا ہے کہ ان کی شخصیت کی تشکیل میں سب سے زیادہ حصہ
ان ہی دو اجزا کا تھا۔ میرے خیال سے یہی بات نواب صدر یار جنگ پر صادق آتی ہے
زندگی کے آخری دور تک پہنچنے پر دونوں کو یہ احساس بھی شدت سے ہو گیا تھا کہ اب وہ
سانچے ہی باقی نہیں رہے جن میں ان جیسے لوگ ڈھلا کرتے تھے اور اس لئے دونوں ایک دوسرے

زیادہ قریب آگئے تھے۔" کاروانِ خیال" میں مولانا آزاد کا پہلا خط ۱۴ستمبر ۱۹۴۰ء کا لکھا ہوا ہے اور اسی خط سے "مراسلتِ جیبین" کے اس سلسلے کا آغاز ہوتا ہے جو "کاروانِ خیال" اور "غبارِ خاطر" کی صورت میں دنیا کے سامنے آیا۔ اس خط میں مولانا آزاد اختلافِ طبائع کے باوجود اشتراکِ ذوق پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں: "میں نظر بندی سے چھوٹا تھا' آپ حیدرآباد سے آئے تھے۔ دونوں جہتوں میں بعد المشرقین تھا مگر طبیعت کی ہم ذوقی ایک صحبت میں جمع کردیتی تھی ؎

"بیا کہ رونقِ این کارخانہ کم نہ شود　　　ز زُہدِ ہمچو توئی یا بفسقِ ہم چو منی"

اسی خط میں گزری ہوئی صحبتوں اور بدلے ہوئے حالات کا ماتم اس طرح ملتا ہے: "افسوس جتنے ہم نفس تھے ایک ایک کرکے سب رخصت ہوگئے' وہ صحبتیں خواب وخیال ہوگئیں۔ اب برسوں گزر جاتے ہیں ایک متنفس میسر نہیں آتا جس سے دو گھڑی بیٹھ کر اپنے ذوق وطبیعت کی چار باتیں کرلوں۔ اب نہ زمانہ ہماری طبیعتوں کا متحمل ہے' نہ ہم زمانے کے سانچوں میں ڈھل سکتے ہیں۔" اسی مجموعے کے ایک اور خط میں رقم طراز ہیں: "اب وہ وقت آگیا کہ ان تذکروں کے لئے کوئی مخاطب نہیں ملتا۔ کہاں جایئے اور کس سے باتیں کیجئے۔ جن سے خطاب تھا وہ سب رخصت ہوگئے۔ ہاں الحمدللہ ایک آپ کی ذات گرامی باقی ہے لیکن یک جائی میسر نہیں ؎

سر دِہ یک نگاہِ آشنا در کس نمی یابم　　　جہان چون نرگستان ہے تو چشم کوری ماند"

اور وہ تذکرے کون سے تھے جن کے لئے "کوئی مخاطب نہیں ملتا" تھا؟ وہی فارسی شعر وادب کی باتیں اور شعراء وادباء کے تذکرے۔ یہ موضوع اس مراسلت میں بار بار آیا ہے اور دونوں طرف سے بڑے جوش وانہماک سے بیان ہوا ہے۔ مثلاً نواب صدر یار جنگ ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں: "فارسی ادب کا ذوق کھونے سے ملک نے بڑی نعمت کھودی۔ کیا جان فزا ادب تھا!" مولانا آزاد زندگی کے آخری برسوں میں بڑی حد تک جائے بند ہوگئے تھے۔ اس کی عجیب عجیب توجیہیں کی گئیں' مخالفوں نے اپنے طریقے سے کیں اور ہم دردوں اور عقیدت مندوں نے اپنے طور پر۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ مولانا کی تنہائی پسندی کا سراغ سب سے زیادہ ان کے اسی احساس میں ملتا ہے کہ وہ جس ماحول میں زندگی گذار رہے تھے وہاں انھیں "اپنے ذوق وطبیعت" کا کوئی انسان

نہیں ملتا تھا۔ بہرحال یہ دوسرا موضوع ہے جس پر لکھنے کا یہ موقع نہیں ہے۔

نواب صاحب اور مولانا کی "پہلی ملاقات لکھنؤ میں ہوئی تھی جب مولانا" الندوہ کی ایڈیٹری کے سلسلے میں وہاں مقیم تھے: ۱۹۰۵ء کی بات ہے"۔ (کاروانِ خیال ص۔۶ مکتوب مولانا آزاد بنام نواب صاحب) ملاقات کا ذریعہ علامہ شبلی نعمانی کی ذات تھی جن سے دونوں کو یکساں عقیدت تھی۔ اس وقت نواب صاحب کی عمر ۲۹ سال تھی اور مولانا کی ۱۷ سال۔ دونوں کی عمر میں تقریباً ایک نسل کا تفاوت تھا لیکن عمروں کا یہ تفاوت رشتۂ موانست قائم ہونے میں مانع نہیں ہو سکا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مولانا کی عبقریت نے انھیں وقت سے پہلے ہی عمر رسیدہ بنا دیا تھا اور ان کے تعلقات عموماً ایک نسل اوپر ہی کے لوگوں سے قائم ہو گئے تھے۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے اس کی شہادت یہ کہہ کر دی ہے کہ جب وہ انگلستان سے تعلیم کمل کر کے ہندوستان آئے تو کانگریس کی مجلس عاملہ کے جلسوں میں دور سے دیکھتے تھے کہ بزرگوں کے ساتھ ایک نوجوان بھی شریک ہوتا تھا اور یہ دیکھ کر انھیں حیرت ہوتی تھی لیکن جب کچھ عرصے کے بعد انھوں نے اس نوجوان کو قریب سے دیکھا تو محسوس کیا کہ "اس کے جوان کندھوں پر بوڑھا سر رکھا ہوا تھا"۔ یہ نوجوان مولانا آزاد ہی تھے۔ اس کے بعد نواب صاحب اور مولانا کی ملاقاتوں کا سلسلہ وقفوں کے ساتھ ۱۵ برس تک جاری رہا۔ اس سلسلے کی آخری ملاقات مولانا ہی کے الفاظ میں "۱۹۲۰ء میں حکیم صاحب مرحوم (مراد حکیم محمد اجمل خاں صاحب سے ہے) کے یہاں دہلی میں" ہوئی۔ ۱۹۲۰ء اور ۱۹۴۰ء کے درمیان ۲۰ سال کی مدت ہے۔ اس کی کوئی شہادت نہیں ہے کہ اس طویل عرصے میں خط و کتابت بھی ہوئی ہو لیکن وقت کے اس فاصلے کے باوجود قلبی تعلق اسی طرح قائم رہا اور جب ستمبر ۱۹۴۲ء میں "الماریوں میں ایک کتاب ڈھونڈتے ہوئے" ندوہ کے بعض رسائل کا مجموعہ "مولانا کے ہاتھ آیا تو "ذہن ندوہ کی صحبتوں کی طرف منتقل" ہو گیا" اور پھر اچانک "نواب صاحب" یاد آ گئے"۔ اور مولانا نے انھیں خط لکھ ڈالا اور اس طرح مراسلت کا وہ سلسلہ شروع ہوا جس نے "کاروانِ خیال" اور "غبارِ خاطر" کی صورت میں اہلِ ذوق کی سیرابی کا سامان مہیا کیا۔ تعلقات کے اس استحکام سے ان دونوں کی استقامت اور مستقل مزاجی پر بہت خوش گوار روشنی پڑتی ہے۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ کبھی درمیان میں باہمی اختلافات کی خلیج نہ حائل

ہوئی ہو۔ ایسا وقت بھی آیا لیکن دونوں کی سلامت روی اختلافات کی اس خلیج پر پُل بن گئی۔
اور تعلقات کی ریشمی ڈور بدستور جُڑی رہی۔ عدم تعاون کی تحریک کے اثرات علی گڑھ کالج میں
بھی پہنچے اور کالج کے بعض سپوتوں نے جذبۂ آزادی کی گرمی اپنے سینوں میں محسوس کی۔ قومی
رہنماؤں نے انھیں اس طرف دعوت دی جن میں مہاتما گاندھی، مولانا محمود الحسن دیوبندی، مولانا
محمد علی اور مولانا آزاد پیش پیش تھے۔ نواب صاحب طبعاً سیاسی ہنگاموں کو ناپسند فرماتے
تھے اور ان کی ایمان داری سے رائے تھی کہ اس تحریک میں شرکت کالج کے مفاد میں نہیں ہے۔ اس لئے
انھوں نے اس کی مخالفت فرمائی۔ "اسٹریچی ہال" میں جلسہ ہوا جس میں مولانا محمد علی نے تحریک میں
طلبہ کی شرکت کی حمایت میں اور نواب صاحب نے اس کی مخالفت میں تقریریں کیں۔ قومی رہنماؤں
کا قیام ادلڈ بوائز لاج میں تھا۔ مولانا آزاد بھی وہیں مقیم تھے۔ شام کو نواب صاحب ان سے ملنے کے لئے
تشریف لے گئے۔ ملاقات ہوئی اور اسی خوش دلی اور گرم جوشی سے ہوئی جیسی ہمیشہ ہوتی تھی۔ علمی
نوادر پر گفت گو ہونے لگی۔ مولانا محمد علی کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ جب واپس آئے تو دیکھا کہ دونوں
دوست محوِ گفت گو ہیں۔ رودررنج آدمی تو تھے ہی، ہال میں داخل ہوتے ہوئے کہا: "آج کل عدم تعاون
کے علاوہ کوئی نادر چیز نہیں ہے"۔ نواب صاحب کو ثقلِ سماعت تھا اس لئے انھوں نے ان کا یہ
جملہ نہیں سنا لیکن مولانا آزاد نے سن لیا اور جواب دیا: "جی نہیں، نواب صاحب کا اور میرا میدان
نہیں ہے۔ ہمارا میدان دوسرا ہے"۔ نواب صاحب کے غیر سیاسی میلان کا مولانا آزاد کو کس قدر
پاس تھا اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ جب قلعۂ احمد نگر کے ایک مکتوب میں غیر اختیاری طور
وقت کے بعض سیاسی حالات و واردات کا ذکر آجاتا ہے تو فوراً موضوع بدلتے ہوئے تحریر فرماتے
ہیں: "مگر مجھے یہ قصہ یہاں نہیں چھیڑنا چاہئے۔ میری آپ کی مجلس آرائی اس افسانہ سرائی کے لئے
نہیں ہوا کرتی 'از ما بجز حکایتِ مہر و وفا مپرس' میری دُکان سخن میں ایک ہی طرح کی جنس نہیں
رہتی لیکن آپ کے لئے کچھ نکالتا ہوں تو احتیاطاً کئی چھلنی میں اچھی طرح چھان لیا کرتا ہوں
کہ کسی طرح کی سیاسی ملاوٹ باقی نہ رہے"۔ یہی رویہ مولانا کے بارے میں نواب صاحب کا
بھی تھا۔ مجھے خوب یاد ہے "غبارِ خاطر" حال ہی میں چھپ کر آئی تھی۔ نواب صاحب ایک
مجلس میں بڑے لطف سے مولانا کی علمی قابلیت اور ادبی صلاحیت کا ذکر فرما رہے تھے۔

مسلم لیگی سیاست کا بحرانی دور تھا۔ ایک صاحب زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر سکے اور مولانا کے سیاسی افکار و اعمال پر اعتراض کر بیٹھے۔ نواب صاحب نے ناگواری سے فرمایا: "ہمارا یہ میدان نہیں ہے، ہم بالکل دوسرے ابوالکلام سے واقف ہیں"۔ "غبار خاطر" کے پیش لفظ میں پروفیسر محمد اجمل خاں نے مولانا کے بارے میں لکھا ہے: "جن دوستوں سے ان کا علاقہ محض علم و ادب کے ذوق کا علاقہ ہے، وہ ان کے علایق کو سیاسی زندگی سے ہمیشہ الگ رکھتے ہیں اور اس طرح الگ رکھتے ہیں کہ سیاسی زندگی کی پرچھائیں بھی اس پر نہیں پڑ سکتی۔ نہ تو کبھی وہ ان دوستوں سے اس کی توقع رکھتے ہیں کہ ان کی سیاسی زندگی کے آلام و مصائب میں شریک ہوں۔ نہ کبھی اس کے خواہش مند ہوتے ہیں کہ ان کے سیاسی افکار و اعمال سے اتفاق کریں"۔ اسی طرح نواب صدر یار جنگ کی وفات پر مسلم یونیورسٹی میں جو تعزیتی جلسہ ہوا تھا اس میں تقریر کرتے ہوئے اس وقت کے وائس چانسلر ڈاکٹر ذاکر حسین خاں نے ان کے بارے میں فرمایا تھا: "مرحوم نے اپنے ماحول کے خلاف اپنے لئے ایک راہ متعین کی اور اس پر چل پڑے ..... انھوں نے اپنے لئے ایک راہ تجویز کر لی تھی لیکن وہ دوسروں کے راستے میں رکاوٹ نہیں بنتے تھے"۔ دونوں بزرگوں کی طبیعت کا یہی رجحان تھا جس کی بدولت بعض معاملات میں اختلاف مسالک کے باوجود آخر وقت تک دوستانہ روابط استوار رہ سکے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا، نواب صاحب اور مولانا آزاد کا سب سے زیادہ مابہ الاشتراک علمی و ادبی ذوق کا رشتہ تھا۔ اس لئے ان کی ملاقاتوں میں گفتگو کا پسندیدہ موضوع یہی ہوتا تھا۔ پہلی ہی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں: "آپ دیوانِ صائب کا ایک نسخہ ابو الحسین سے لینا چاہتے تھے۔ اسی کی حیثیت پر گفتگو ہوئی تھی"۔ لیکن یہ سوچنا درست نہیں ہوگا کہ ان ملاقاتوں میں لطف و تفریح کا کوئی شائبہ نہیں ہوتا تھا۔ نواب صاحب کے مصاحب خاص حاجی ملا احمد تھے، مولانا کو بھی ان سے دلچسپی تھی۔ لکھنؤ میں ایک دفعہ مولانا کو بخار آیا، انھوں نے کونین استعمال کی۔ کونین کے خلاف اس وقت قدیم خیال کے لوگوں میں بہت تعصب تھا۔ ملا صاحب بھی اسی خیال کے تھے۔ اس وقت جو کیفیت ہوئی اس کا حال خود مولانا کے الفاظ میں سنئے۔ ملا صاحب کو یاد کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں: "معلوم نہیں، ملا صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ کیا حال ہے؟ ان کا کونین کو "کونین" بزورِن زدجین کہنا اس وقت بھی دماغ میں گونج رہا ہے۔ آپ کو

موقع یاد آیا؛ جلسۂ ندوہ کے موقع پر جب مولوی عبدالاحد مرحوم کے یہاں ٹھہرے ہوئے تھے اور مجھے بخار آیا تھا۔ میں نے کونین کی مقدار بڑھانی شروع کی اور ملّا صاحب نے اس کے مثالب و نتائج پر مسلسل لکچر دینا شروع کر دیا۔ افسوس۔ اب ان صحبتوں کی صرف یاد باقی رہ گئی ہے"۔ اس کے جواب میں نواب صاحب نے تحریر فرمایا: "ملّا صاحب سلامِ شوق پیش کرتے ہیں اور کونین بزور زوجین کے ذکر میں دوسرا جزو بڑھاتے ہیں کہ دو بجے شب کو دودھ لانے کا حکم ہوا تھا، تعمیل ہوئی تھی"۔ مولانا نے اس واقعہ کی تصدیق یہ لکھ کر فرمائی: "ملّا صاحب کے سلامِ شوق سے بہت جی خوش ہوا۔ میرا بھی سلام انھیں پہنچایئے اور ان کے حافظے کی داد دیجئے"۔ انھیں ملّا صاحب کے ساتھ مولانا کی بے تکلفی اور لطف کا مشاہدہ بعض لوگوں نے اس وقت کیا جب مولانا ۱۹۴۹ء کے شروع میں بحیثیت وزیر تعلیم حکومت ہند علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سالانہ کانوکیشن کو خطاب کرنے کے لئے تشریف لائے اور اپنے "صدیقِ مکرم" کے ساتھ چند لمحے گذارنے کے لئے ان کے مکان "حبیب منزل" میں قدم رنجہ فرمایا۔ مولانا کے بعض عقیدت مند چاہتے تھے کہ نواب صاحب کے ساتھ ان کا فوٹو لیں لیکن کسی کو یہ عرض کرنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ ان لوگوں نے ملّا صاحب کو اس کام کے لئے تاکا اور وہ فوراً راضی ہو گئے۔ ڈائننگ روم میں جا کر مولانا کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا کہ آیئے ذرا باہر تشریف لایئے۔ مولانا پوچھتے ہی رہے کہ کیا بات ہے اور انھوں نے باہر لا کر کھڑا کر دیا۔ ساتھ میں نواب صاحب بھی باہر تشریف لے آئے۔ جب مولانا کو صورتِ حال کا احساس ہوا تو بہت لطف لیا اور بڑی خوش دلی سے فوٹو اتروایا۔ (یہی فوٹو اس اشاعت میں شائع ہو رہا ہے۔ ملا صاحب، نواب صاحب اور مولانا کے درمیان میں ہیں)۔

بعض شخصیتیں ایسی تھیں جن سے نواب صاحب اور مولانا کو یکساں تعلق خاطر تھا۔ ان میں سب سے پہلی ذات علامہ شبلی نعمانی کی تھی۔ ان کا ذکر دونوں نے جس والہانہ انداز اور لطف کے ساتھ کیا ہے۔ نواب صاحب تحریر فرماتے ہیں: "مولانا شبلی پر خدا کی رحمت۔ اب تک ان کی یاد جاں آفریں ہے۔ دار المصنفین میں تو گویا تجدید بیعت ہو جاتی ہے ؎

داغ دل دریں جا گاہ گلے چاق می گردد خدا آباد تر ساند خرابات محبت را"

اور مولانا آزاد ان کے حضور میں خراج عقیدت اس طرح پیش فرماتے ہیں: "فی الحقیقت

مرحوم کی ذات نبوغ و کمال کے رنگا رنگ مظاہر کا ایک عجیب مجموعہ تھی۔ جیسا کہ فارسی میں کہتے ہیں، سرتا سر مغز بے پوست تھی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ کیا گئے، علم و فن کی صحبتوں کا سرتاسر خاتمہ ہوگیا۔ ۔ ۔ ۔ ہر دائرہ میں وہ اپنے ذوق و فکر کی ایک خاص اور بلند جگہ رکھتے تھے۔ اور یہ کتنی بڑی خوبی تھی کہ باوجود ملّایانہ طلبِ علم کے ملّائیت کی پرچھائیں بھی ان پر نہیں پڑی تھی۔ خشکیِ طبع، جو اس راہ کے مہالک و آفات میں ہے، انھیں چھو بھی نہیں گئی تھی۔ ۔ ۔ ۔ ہندوستان میں فارسی شاعری غالب پر نہیں، ان پر ختم ہوئی"۔ ایک دوسری ذات حکیم محمد اجمل خاں کی تھی۔ ان کے بارے میں مولانا آزاد تحریر فرماتے ہیں: "ان کی یاد دہلی کے ساتھ اس طرح وابستہ ہوگئی ہے کہ یہ لفظ بغیر انھیں یاد کیے بول نہیں سکتا۔ دل کے بہت زخم ہیں جو امتدادِ زمانہ سے داغ بن کر رہ گئے ہیں۔ ع اب جس جگہ کہ داغ ہے یاں پہلے درد تھا۔ لیکن یہ زخم اب تک نہ بھر سکا ع جو شیدِ خونِ تازہ ز داغِ کہن مرا"۔ بعض اور بھی حضرات ہیں جن کا ذکر نواب صاحب اور مولانا کی خط و کتابت میں اکثر آتا ہے۔ ان میں خاص طور پر قابلِ ذکر آصف علی صاحب اور ڈاکٹر سید محمود ہیں۔ ڈاکٹر محمود سے ایک ملاقات کا حال نواب صاحب کس خلوص اور لطف سے بیان فرماتے ہیں: "ڈاکٹر سید محمود برسوں میں ملے، پھر بھی دل اثرِ اخلاص سے بدستور نرم و گرم تھے۔ ملے اور خوب ملے بڑی جان افزا اور روح پرور صحبت رہی: ؎

ہر جا کہ من و دوست بہم باز رسیدم — از بیم بد اندیش لب خویش گزیدیم
بے واسطۂ گوش و لب از راہِ دل و چشم — بسیار سخن بود کہ گفتیم و شنیدیم

یہاں نواب صدر یار جنگ کے کردار کے ایک پہلو کی طرف اشارہ کر دینا بے جا نہیں ہوگا۔ وہ رئیس ابن رئیس تھے۔ طبعاً سیاست کی ہنگامہ آرائیوں سے دور رہنا پسند کرتے تھے۔ تحریک عدم تعاون میں علی گڑھ کالج کی شرکت اور عدم شرکت کے مسئلے پر بعض قومی رہنماؤں سے ان کے اختلافات بھی رہے تھے لیکن با ایں ہمہ وہ انگریز پرست ہرگز نہیں تھے بلکہ ہندوستان پر غیر ملکی تسلط کا انھیں بہت افسوس تھا۔ اگرچہ اس میں سیاسی شعور سے زیادہ قدیم تہذیبی روایات کے زیاں کے احساس کو دخل تھا جو دیکھ سے انھوں نے

۱۹۴۲ء سے پہلے ایک دفعہ فرمایا کہ جب کوئی نیا ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ علی گڑھ آتا ہے تو ہم اس سے صرف ایک دفعہ ملنے کے لئے جاتے ہیں، بغیر ضرورت کے دوبارہ کبھی نہیں جاتے۔ اس وقت سرکاری کارندوں کے ساتھ زمین داروں کا عام طور پر جو رویہ تھا اسے دیکھتے ہوئے یہ معمولی بات نہیں تھی۔ انگریزی حکومت نے کئی دفعہ کوشش کی کہ انھیں خطاب سے نوازے لیکن انھوں نے کبھی اس کے لئے آمادگی ظاہر نہ فرمائی۔ ایک دفعہ معلوم ہوا کہ ان کے لئے شمس العلماء کے خطاب کی سفارش ہونے والی ہے تو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو مطلع کر دیا کہ اگر انھیں خطاب دیا گیا تو اسے قبول نہیں کریں گے اور اس سے غلط فہمی پیدا ہوگی۔ اس لئے مناسب یہ ہے اس کی سفارش نہ کی جائے۔ دوسروں کو بھی جب خطاب ملتا تھا تو اس کا ذکر تمسخر سے کرتے تھے۔ اکثر فرماتے تھے کہ جب مغل سلاطین کسی کو اعزاز عطا کرتے تھے تو اس کے ساتھ جائداد بھی دیتے تھے۔ لیکن اس کے برعکس انگریز چندہ لے کر خطاب دیتے ہیں۔ البتہ ریاست حیدر آباد کا خطاب "صدر یار جنگ" انھوں نے نہ صرف قبول فرمایا بلکہ بعض اوقات دستخط بھی یہی فرماتے تھے۔ دوسری عالمی جنگ کے دوران میں انھیں انگریزوں کے مقابلے میں محوری طاقتوں سے ہمدردی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس کی وجہ ہندوستان کی غلامی کا شدید احساس ہی تھا۔ اگرچہ عملی سیاست سے بے تعلق ہونے کی بنا پر محوری طاقتوں کی فتح کے اثرات کا پورا ادراک نہیں کر پاتے تھے۔ صوبۂ سرحد کے آزاد قبائل کی ان کے دل میں اس وجہ سے بڑی قدر تھی کہ انھوں نے بدیشی حکومت کا تسلّط قبول نہیں کیا تھا۔ ان کی طبیعت کا یہی پہلو تھا جس کی بنا پر انھیں بعض قومی رہنماؤں سے خصوصی تعلّق خاطر تھا۔ ان میں مولانا آزاد کے علاوہ حکیم محمد اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، پنڈت موتی لال نہرو، مسز سروجنی نائیڈو، مولانا حسین احمد مدنی، مسٹر آصف علی اور ڈاکٹر سید محمود خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ تصدق احمد خاں صاحب شروانی اور نثار احمد خاں صاحب شروانی کی تعلیم میں ان کا بڑا ہاتھ تھا اور قومی زندگی میں ان کی ترقیوں سے بہت خوش ہوتے تھے البتہ کسی شخص سے تعلق خاطر ہونے کی ان کے یہاں دو بہت ضروری شرطیں تھیں، سلامت روی اور رکھ رکھاؤ۔ اسی لئے علی برادران، مولانا حسرت موہانی، مولانا ظفر علی خاں اور عطاء اللہ شاہ بخاری جیسے لوگوں سے انھیں کبھی دلچسپی نہیں ہو سکی۔ مولانا شبیر احمد عثمانی کے اس

رویئے سے بھی نالاں تھے کہ انھوں نے سیاسی اختلافات کو دارالعلوم دیوبند کے اندرونی معاملات میں اثر انداز کرنے کی کوشش کی تھی۔ اسی طرح مہاتما گاندھی کی تبدیلیٔ ہیئت کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ جب ہندوستان آزاد ہوا تو میں علی گڑھ سے باہر تھا اس موقع پر مجھے حبیب گنج سے خاص طور پر مبارک باد کا خط تحریر فرمایا جس میں لکھا:

"کل بعد جمعہ جشن ۱۵ اگست منایا گیا۔ شب کو چراغاں ہوا۔ مبارک"۔ ہندو مسلم مناقشات سے انھیں قلبی تکلیف ہوتی تھی اور ایسے موقعوں پر گزرے ہوئے زمانے کو یاد فرماتے تھے۔ جب ہندو مسلمان مثل بھائیوں کے شیر و شکر رہتے تھے۔ ستمبر ۱۹۴۷ء میں ہندو یونیورسٹی بنارس کے اُستاذ رام کمار چوبے صاحب کو ان کے خط کے جواب میں لکھا: "آج کل "ہندو مسلمان" کا ہنگامہ ہے۔ ہنگامہ جہاں ہوگا۔ جو دل ملے ہیں ان میں وہ رنگ ہے جو آپ کے خط کا ہے اور جو میرے دل کا ہے۔ آپ یقین کریں جو ہنگامہ آج ہے اس کا اثر کبھی دل پر نہیں ہوا.... ہندو مسلمان کا سوال کیسا!" حصولِ آزادی اور تقسیم وطن کے بعد ہندوستانی مسلمانوں میں ترکِ سکونت کرکے پاکستان جانے کی جو لہر اٹھی تھی اسے بالکل پسند نہیں فرماتے تھے اور لوگوں کو اس سے باز رہنے کی تلقین کرتے تھے۔

نواب صاحب اور مولانا آزاد کو ایک دوسرے سے جو گہرا قلبی تعلق تھا اس پر "کاروانِ خیال" اور "غبارِ خاطر" کے خطوط شاہد ہیں۔ یہ رنگ "کاروانِ خیال" کے خطوط میں اس لئے زیادہ گہرا ہے کہ وہ واقعی خطوط ہیں، خیالی مضامین نہیں ہیں۔ تاہم اس اعتبار سے "غبارِ خاطر" کی بھی بہت اہمیت ہے کہ اس مخاطبت کے لئے مولانا آزاد نے نواب صاحب ہی کا انتخاب فرمایا جس پر مولانا سید سلیمان ندوی نے حسرت سے لکھا کہ ان خطوط کے "مخاطب تنہا صدیقِ مکرم حبیب الرحمٰن خاں شروانی ہیں"۔ خود نواب صاحب کو بھی اس کا بہت احساس تھا، چناں چہ "غبارِ خاطر" کی وصول یابی پر مولانا آزاد کو تحریر فرماتے ہیں!

"اسی عرصے میں دو نسخے "غبارِ خاطر" کے نور افزا ہوئے۔ غبار اور نور افزائی! ہاں، نور افزائی! غبار تھا کوئے دوست کا! آنکھوں سے لگایا، پڑھا۔ پڑھوں گا۔ زہے قسمت کہ گوشۂ تنہائی میں جلیس محبت حبیب رہا۔ بزمِ اُنس اس قدر طویل کہ ایک مجلد کا سامان تھی۔ میرا خیال ہے کہ

یہ واقعہ تاریخی واقعہ بنے گا۔ شکرِ نعمت ہائے تو چنداں کہ نعمت ہائے تو۔" مولانا آزاد تو تقریباً ہمیشہ ہی نواب صاحب کو "صدیق" مکرم سے مخاطب کرتے تھے مگر نواب صاحب نے مختلف خطوط میں مختلف القاب لکھے ہیں اور ان سے بھی مولانا کے لئے نواب صاحب کے جذباتِ خلوص و مودّت کا اظہار ہوتا ہے۔ ان کا سب سے پسندیدہ طرزِ تخاطب "صدیق حبیب" ہے۔ بعض دوسرے القاب یہ ہیں: مکرم حبیب، صدیقِ حمیم، حبیب نواز، آشنا پرور، صدیق حبیب بہ دل قریب، اور "صدیق مکرم" کے مکرم باکرامت۔ ایک کو دوسرے کا خط آنے پر جو مسرت ہوتی تھی اور دونوں ایک دوسرے کے لئے جن جذباتِ خلوص و اُنس کا اظہار کرتے تھے ان کا اندازہ بعض اقتباسات سے بہ خوبی ہو سکتا ہے۔ نواب صاحب پہلا خط موصول ہونے پر تحریر فرماتے ہیں:

"کیا کہوں کس قدر مسرت نامۂ گرامی پڑھ کر ہوئی۔ اسی وقت مکرر پڑھا۔ اس کے بعد کئی بار پڑھ چکا ہوں۔ ہر بار دماغ دل بوئے محبت سے باغ باغ ہوا ہے۔ خلوص سدا بہار ہے اور اس منکاتہ ہستی میں یہی ایک نعمت ابدی ہے۔" اس کے جواب میں مولانا لکھتے ہیں: سفر سے واپس ہوا تو ڈاک میں صحیفۂ مودّت ملا۔ طبیعت تھکی ہوئی اور ہجومِ اشغال سے بے کیف تھی لیکن آپ نے پچھلی صحبتوں کی یاد تازہ کر کے ساری تھکن بھلا دی ؎

وحدثتنی یا سعد عنها فزدتنی | جنوناً فزدنی من حدیثک یا سعد!

. . . دیکھئے آپ کی صدائے دل نواز نے دلِ ہزار شورش کے ساتھ کیا کیا، جدید آدابِ مکاتبت سے قطعِ نظر کر کے کاغذ کے دونوں صفحے سیاہ کرتا رہا، پھر بھی پانچ ورق ختم ہو چکے اور شوق مخاطب ہے کہ رکنے کا نام نہیں لیتا ؏ بہ صد دفتر نمی گنجد حدیثِ دردِ مشتاقے

ہر چند چاہتا ہوں قلم روکوں مگر روک نہیں سکتا۔" ایک اور خط میں نواب صاحب رقم طراز ہیں: "صحیفۂ ثانیہ کا شکر مکرر.... ایک بار پڑھا، اسی صحبت میں دوبارہ پڑھا، تیسری مرتبہ آواز سے پڑھا...... ہر بار کے پڑھنے میں یہ عالم تھا کہ دل کسی مخلص کے معانقے کی گرمی کا لطف محسوس کر رہا تھا۔ آنکھیں پُرنم تھیں۔ چوتھی مرتبہ اس وقت پڑھا کہ جواب لکھنے بیٹھا ہوں" اس کے جواب میں مولانا جذباتِ لطف و محبت کا اظہار اس طرح فرماتے ہیں: "تعلیقہ گرامی میں صرف الفاظ ہی نہ تھے، خوشبو بھی تھی۔ آنکھیں سوادِ خط سے خورسند ہوئیں، دماغ نے

محبت بے ریا اور خلوصِ اہلِ صفا کا عطر سونگھا۔ انفلوئنزا کی شدت سے سر قابو میں نہ تھا۔
جسم بے حال ہو رہا تھا۔ ع ز بے تابی سرم می گردد و بالین نمی باید
مگر آپ کی صدائے محبت نے اٹھا کر بٹھا دیا۔ اب تکیہ کے سہارے یہ سطریں لکھ رہا ہوں ؎

"نسیم جاں فزایت دلِ مردہ زندہ گردد ز کدام باغ اے گل کہ چنیں خوش ست بویت"

ایک سالہ نظر بندی سے رہائی کے بعد ۱۹ فروری ۱۹۴۴ء کو مولانا نے نواب صاحب کو صرف ایک شعر لکھ کر بھیجا ؎

"وفا کنند کہ بیگانہ آشنا گردد ترا چہ شد کہ نمی پرسی آشنائے را"

دیکھئے اس کا جواب نواب صاحب کس خلوص و محبت سے دیتے ہیں: "گل جاں پرور نامہ پہنچا۔ دیکھ کر دل فرطِ شوق سے تڑپ گیا۔ زبان سے بے اختیار نکلا ؎

"بوئے خوشِ تو ہر کہ ز بادِ صبا شنید از یارِ آشنا سخنِ آشنا شنید"

گو یہ نامہ صرف ایک سطر تھی مگر ایک دفترِ محبت اس میں بھرا ہوا تھا۔ محبت نہ ہو تو شکوۂ ناآشنائی کیوں ہو جو شکوہ خبرِ محبت دے اس پر سو شکر قربان.... شکر ہے کہ بالآخر نظرِ آشنائے توجہ ہوئی، نصف مکالمت کا موقع ہاتھ آیا۔ شکوۂ ناآشنائی نے کیا کہوں کیا لطف دیا۔ کس زبان سے کہوں، کس قلم سے لکھوں...... ارادہ کیا صبح جواب لکھوں گا، نصف ملاقات کا سرور حاصل کروں گا۔ اسی سرور میں آمادۂ خواب ہوا۔ آمدِ خواب کے کیف میں جانبِ نشاپور سے آواز آئی ؎

"شبِ امید بہ از صبحِ عیدی گزرد کہ آشنا بتمنائے آشنا خفتہ است"

لیکن وہ بالا ہو گیا۔ شب کو جب آنکھ کھلی، یہی آواز جاں نواز تھی۔ بیداری بھی خواب کی طرح شیریں رہی۔ ارشاد ہے نمی پرسی، حقیقت سنج محبت عرفی شیرازی نے جس کے آشنا سنج ہونے کی قسم کھائی ہو وہ نہ پوچھے، کیوں کر ممکن ہے؟ ؎

بنامِ آں حبیبِ آشنا سنج کہ در آرائشِ معمورۂ رنج

...صرف انتظار موقع تھا، حافظ کا یہ شعر وردِ زبان ؎

"شب دریں امیدم کہ نسیمِ صبحگاہی بہ پیامِ آشنائے بنوازد آشنا را

شکر ہے موقع آیا، شکوۂ ناآشنائی ہوا، بروقت ہوا اور بجا ہوا۔ زندہ باد آزاد!!"

ایک دفعہ کسی معروفیت کی بنا پر نواب صاحب، مولانا کے خط کا جواب نہیں بھیج سکے تو مولانا نے یہ شعر لکھ کر بھیجا ؎

شرابِ لطف بہ در جام می ریزی دمی ترسم — کہ زود آخر شود این نشہ و من در خمار افتم"

جواب میں نواب صاحب نے اسی شعر کو بدل کر اس طرح لکھ دیا ؎

"شرابِ لطف من دارم خُمِ اندر خُم، چہ می ترسی — نہ زود آخر شود این نشہ و نے در خمار افتی

جب مولانا جون ۱۹۴۵ء میں قلعۂ احمد نگر کی طویل نظر بندی سے رہا ہو کر سیاسی مذاکرات میں حصہ لینے کے لئے شملہ پہنچے تو وہیں دیسرائے گل لاج سے پھر صرف ایک شعر کا خط لکھا ؎

"اے غائب از نظر کہ شُدی ہم نشینِ دل — می بینمت عیان و دعای فرستمت"

اس کا جواب بھی نواب صاحب نے حسبِ معمول پورے لطف و مروت سے دیا۔ لکھتے ہیں:

"جس دن بدرِ کامل گہن سے نکلا تھا، دل نے شہادت دی کہ نورِ محبت جان نواز ہوگا۔ ہوا اور کس شان سے۔ ۲۰ جون کو پہاڑ کی چوٹیوں کا ہنگامہ ایک گروپ کے رنگ میں نظر آیا۔ اس پر ایک پیکرِ محبوب بھی تھی۔ قینچی لی، مجمعِ اغیار سے جدا کیا۔ دیکھا شیراز کی طرف سے صدا آئی ؎

روشن از پرتوِ رویت نظرے نیست کہ نیست — منتِ خاکِ درت بر بصرے نیست کہ نیست

...... خیر یہ شیراز کا ترانہ تھا۔ کان لگاتا ہوں تو شملہ سے دوسرا ترانہ سامعہ نواز ہوتا ہے

اے غائب از نظر کہ شُدی ہم نشینِ دل — می بینمت عیان و دعای فرستمت

جو کان نے سنا، تیسرے روز نقوشِ دل فروز کے پردے میں آنکھوں نے دیکھ لیا۔ اجازت ہو تو دوسرا مصرعہ میں بھی لکھ دوں کہ "می بینمت عیان و دعای فرستمت" کچھ عرصے کے بعد مولانا بحالیٔ صحت کے لئے گل مرگ (کشمیر) تشریف لے گئے تو نواب صاحب نے حسبِ ذیل "نامۂ منظوم" وہاں بھیجا ؎

"بجز نظارۂ گل مرغ نگارے دارم — کز خیالش بہ دلِ زار بہارے دارم

اے نسیم سحری گر بہ حضورش گزری — عرضہ دہ شوق کہ در جان فگارے دارم

ور بپرسد کہ مگر شوق پیامے دارد — سر فرود آر و دو من گوشہ آرے دارم

اور ساتھ ہی یہ شعر بھی لکھا ؎

"دوستاں را بہ نعمت یاد کردن ہمت است　　ورنہ ہر نخلے بپائے خویش افشاند ثمر"

اور آخر میں دستخط اس طرح کئے: "اسیرِ آزاد' حبیب"۔ قدرتی طور پر مولانا اس سے بہت مُتاثر ہوئے اور جواب میں لکھا: "کیا عرض کروں' کس درجہ طبیعت مُتاثر ہوئی۔ سرتاپا شکر گزار اور ہمہ تن رہینِ منت ہوں ؎

قلیل منک یکفینی ولٰکن　　قلیلک لایقال لہ قلیل"

یہ تو نصف ملاقات پر جذباتِ لطف و مودّت کی کیفیت تھی لیکن مکمل ملاقات کے لئے دونوں کتنے بے تاب تھے اور دونوں طرف شوقِ لقا کی آگ کتنی تیز تھی اِس کا اظہار بھی "کاروانِ خیال" کے خطوط میں بار بار ہوتا ہے اور پوری گرم جوشی سے ہوتا ہے۔ پہلے ہی خط میں مولانا آزاد تحریر فرماتے ہیں: "بے اختیار جی چاہا کہ آپ سے ملاقات ہوتی' افکارِ زمانہ اور کاوش ہائے روزگار سے الگ ہو کر دو گھڑی بیٹھتے اور پچھلی صحبتوں کی یاد تازہ کرتے۔ جام و مینا کا دور نہ سہی' چائے کے پیالہ ہائے پیہم کیا کم ہیں ؎

زخیلِ دُردکشاں غیرِ ما نماند کسے　　بیار بادہ کہ ماہم غنیمتیم بسے"

اس کے جواب میں نواب صاحب رقم طراز ہیں: "محبت نامے نے شوقِ ملاقات کی سوزش میں اشتعال پیدا کر دیا ہے۔ دل میں بے تابی ہے کہ ملاقات ہو جو صحبتِ گذشتہ کی گرمی تازہ کر کے حیات تازہ بخشے۔ سوال یہ ہے کہ کہاں ہو؟" پھر مولانا لکھتے ہیں: "کاش خط کی جگہ ہم نشینی و ہم زبانی کا موقع نکلتا۔ اگر گذری ہوئی محفلوں کو واپس نہیں لا سکتے تو کم از کم ان کی یاد میں اپنی سوگواریوں کی ایک نئی محفلِ غم تو برپا کر سکتے ہیں ؎

یہ آرزو تھی تجھے گل کے روبرو کرتے　　ہم اور بلبلِ بے تاب گفتگو کرتے"

ایک اور خط میں مولانا ہی تحریر فرماتے ہیں: "اگر حالات کی رفتار ایسی نہ ہوتی تو یقین کیجئے کہ آرزومندی کی شورشوں کا یہ حال ہے کہ کلکتہ سے اُٹھتا اور سیدھا بھیکم پور پہنچ کر آپ سے بغل گیر ہوتا ؎

وابرح مایکون الشوق یوما　　اذا دنت الخیام من الخیام"

ایک دفعہ نواب صاحب کسی کام سے حیدرآباد تشریف لے گئے۔ واپسی میں وارد ھا اسٹیشن

پہنچنے پر معلوم ہوا کہ مولانا کی "دس منٹ پہلے تشریف بری ہو چکی تھی"۔ جب اس کی اطلاع مولانا کو دی تو انھوں نے جواب میں حسرت سے لکھا: "کیا عرض کروں، وادودھا کے اسٹیشن پر ملاقات نہ ہو سکنے کا کس درجہ افسوس ہوا۔ آج کل نظم و نسق کا سارا کارخانہ درہم برہم ہو رہا ہے۔ کوئی ٹرین وقت پر نہیں پہنچتی۔ کم بخت کلکتہ میل کو اُسی دن وقت پر پہنچنا تھا۔ آپ سے ملاقات کا معاملہ میرے لئے وہی ہو گیا ہے جو غالب کو پیش آیا تھا کہ گر نہ ہو تو کہاں جائیں ہو تو کیوں کر ہو! معلوم نہیں اِدھر دہلی جانے کا کوئی موقع نکلتا ہے یا نہیں لیکن اگر نکلے اور میں آپ کو اطلاع دوں تو کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ایک دو دن کے لئے آپ بھی اس خرابے میں آنکلیں!" بہرحال بڑی حسرت و تمنا کے بعد ۱۹۴۶ء میں ملاقات کی صورت نکلی جو بائی اسمبلی کے انتخابات ہو چکے تھے اور مولانا وزارت سازی کے سلسلے میں لکھنؤ گئے ہوئے تھے حسن اتفاق سے نواب صاحب بھی اسی زمانے میں کسی کام سے وہاں تشریف لے گئے۔ جب معلوم ہوا کہ مولانا تشریف فرما ہیں تو کیسے ممکن تھا کہ بغیر ملے ہوئے چلے آتے۔ ملاقات ہوئی لیکن دیر غیر پر اور اجنبی ماحول میں۔ مولانا کی مصروفیت ظاہر تھی اور اس لئے فراغت اور اطمینان کی ملاقات ممکن نہیں تھی۔ اس ملاقات کی کیفیت ۲۸ مئی ۱۹۴۶ء کے خط میں مولانا ہی کو لکھتے ہیں: "اس روز لکھنؤ میں نظارۂ جمال اگرچہ کہ خوش درخشید و لے دولت مستعجل بود کا مصداق تھا۔ تاہم دل میں گرمیِ شوق پیدا کرنے میں کامیاب تھا۔ دن بھر بکر رشوقِ لقا کی تمنا رہی.... تقاضائے شوق تھا کہ چند ساعتیں لطفِ صحبت بخشیں ...... مگر دل کی تمنا دل میں رہی"۔ اس کے چند مہینے کے بعد یکم نومبر ۱۹۴۶ء کو مولانا تحریر فرماتے ہیں: "بہت جی چاہتا ہے کہ یکجائی کی صورت نکلے لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔ ادھر قصد کر رہا ہوں کہ کچھ عرصہ دہرہ دون میں قیام کروں کیونکہ صحت جواب دے رہی ہے...... کاش ایسا ہو سکتا کہ آپ دو چار دن کے لئے دہرہ دون تشریف لا سکتے اور میرے ساتھ قیام فرماتے ؎

زخندہ شبے باید و خوش مہتابے تا با تو حکایت کنم از ہر بابے"

اس کے جواب میں نواب صاحب لکھتے ہیں اور کتنی گرم جوشی اور شگفتگی سے لکھتے ہیں:

"دو التفات نامے سامنے ہیں .... دوسرے میں قدوم دہرہ دون کی (خبر ہے)

اس کے بعد مخلص کی یاد فرمائی یقین کیجیے دل مسرت شوق سے تڑپ گیا۔ آیئے آیئے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ
جب ہم دلی و ہم نشینی ہوگا۔ طاہر بھی ساتھ ہوں گے..... ماشاء اللہ کیا پرلطف وقت ہوگا جب کہ

گرچہ دوریم بیادِ تو قدح می نوشیم　　بُعدِ منزل نہ بود در سفرِ روحانی

کے جواب میں اپنا ایک شعر عرض کروں گا ؎

شکر اللہ! بروئے تو قدح می نوشیم　　جلوۂ قرب نمودہ سفرِ جسمانی۔"

چوں کہ مولانا آزاد نے اپنے خط میں خرابیٔ صحت کی اطلاع بھی دی تھی اس لئے اس پر اظہارِ تشویش
کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "آپ کی صحت صرف آپ کی ملکیت نہیں ہے، ملک و ملت برابر کے بلا
شرکت غالب ہیں لیکہ با اخلاص مخلص بھی۔ لہٰذا اس کی حفاظت کی خاطر سے آرام کیجئے دہرہ دون کا سفر
کیجئے مخلص کی یاد فرمائی ہو۔" لیکن مولانا آزاد دہرہ دون نہ جا سکے اور یک جائی و ہم نشینی کا موقع
نہیں مل سکا۔ جنوری ۱۹۴۷ء میں وہ مرکزی کابینہ میں وزیر تعلیم مقرر ہوگئے اور مستقل دہلی میں
قیام ہوگیا۔ علی گڑھ سے دہلی دور نہیں تھی لیکن ایک طرف نواب صاحب کی صحت کمزور ہوگئی تھی
اور دوسری طرف مولانا کی مصروفیات اور پریشانیاں روز افزوں تھیں اس لئے عرصے تک
ملاقات کی صورت نہیں نکل سکی۔ ۱۹۴۸ء کے آخر میں اس وقت کے گورنر جنرل شری راج گوپال
اچاری کا علی گڑھ یونیورسٹی میں آنا طے ہوا۔ کسی نے نواب صاحب کو بتایا کہ اس موقع پر مولانا آزاد
کی تشریف آوری بھی ہوگی۔ نواب صاحب نے انھیں دعوت دی کہ جب علی گڑھ تشریف لائیں
تو "حبیب منزل" میں قیام فرمائیں۔ اس کے جواب میں مولانا نے تحریر فرمایا: "۱۵ دسمبر والی اطلاع
صحیح نہیں ہے۔ ابھی کوئی تاریخ متعین نہیں ہوئی۔ جب بھی موقع پیدا ہوگا، آؤں گا، اور
ملاقات سے شادکام ہوں گا۔ حبیب منزل میں قیام کی دعوت کے لئے شکر گزار ہوں لیکن کیا
اس کی ضرورت تھی؟ آپ دعوت دیں یا نہ دیں، اگر میں کہیں ٹھہر سکتا ہوں تو وہ صرف آپ ہی کا
آستانۂ محبت ہے ـــــ درین شہر سعدی شناسیم و بس!"

مولانا کی تشریف آوری ۱۹۴۹ء میں ہوئی۔ نواب صاحب نے جس ذوق و شوق سے
یونیورسٹی کانووکیشن میں شرکت فرمائی اس کا حال مدیر "نیا ہندوستان" علی گڑھ کے الفاظ
میں سنئے: "حضرت شروانی (نواب صدر یار جنگ بہادر) نے دیدار کی حسرتیں جس انداز میں

نگاہیں وہ دیدنی تھیں۔ آپ نے ایک موقع پر فرمایا تھا کہ میں تو صرف یہ دیکھنے کو نوکیش[illegible]
اجلاس میں جاؤں گا کہ ابوالکلام آج اس دعجۂ علیاپر فائز ہوکر کیسے معلوم ہوتے ہیں!"
جن لوگوں نے نواب صاحب کو امام الہند کے چہرے کی طرف سراپا اشتیاق نظروں سے
گھورتے ہوئے دیکھا ہے کچھ وہی اس سے حظ اٹھا سکتے ہیں ؎

پھر ہم کہاں، کہاں تم، جی بھر کے دیکھنے دو
اللہ! کتنی مدت تم سے جدا رہے ہیں۔"

مولانا کا قیام تو اپنے سیلون میں اسٹیشن پر رہا لیکن حبیب منزل تشریف آ[illegible]
اور چار نوشی ہوئی اور "نیا ہندوستان" ہی کی شہادت کے مطابق "پچھلی علمی وادبی مجم[illegible]
یگانۂ روزگار ہستیوں اور کتابوں اور کتب خانوں کا ذکر ہوتا رہا۔ اس کے بعد ان دونو[illegible]
دوستوں کی ملاقات پھر کبھی نہیں ہوسکی تا آنکہ ۱۱ر اگست ۱۹۵۰ء کو نواب صدر یار جنگ
نے رحلت فرمائی۔ سدا رہے نام اللہ کا۔

افسر حسین شمیم

مولوی عبدالحق

یادِ ماضی کے ابھی نقش بہت باقی ہیں
حافظِ دل کی طرح زُود فراموش نہیں

مولوی عبدالحق سے سب سے پہلے میری ملاقات ۱۹۳۵ء میں لاہور میں ہوئی تھی۔ یہ بات اس وقت کی ہے جب وہ انجمنِ حمایتِ اسلام کے سالانہ جلسے میں شعبۂ اردو کے اجلاس کی صدارت فرمانے تشریف لائے تھے، اس موقع پر مجھے ان کی ذات اور ان کے کاموں کے متعلق ایک تقریر پڑھنی پڑی تھی، لیکن میں ان کے نام سے کم عمری ہی سے واقف تھا اور "قواعدِ اردو" کے علاوہ ان کی تحریریں میری نظر سے گذر چکی تھیں بلکہ دو چار بار ان سے خط و کتابت ہوئی تھی اور دو تین مرتبہ انہوں نے مجھے کچھ انجمن کا اور کچھ حیدرآباد دکن کے ایک پبلشر کا ادبی کام بھیجا اور اس کا معاوضہ ادا کیا تھا۔

لاہور میں مولوی صاحب کے قیام کا انتظام میاں بشیر احمد صاحب ایڈیٹر "ہمایوں" کے مکان "المنظر" واقع لارنس روڈ پر کیا گیا تھا۔ اس زمانے میں قریب قریب روزانہ مجھ سے مولوی صاحب کی ملاقات ہوا کرتی تھی۔ جب لاہور میں اس چند روزہ قیام کے بعد مولوی صاحب اورنگ آباد دکن واپس گئے تو ان سے دو تین بار خط و کتابت ہوئی اور ایک بار میں نے ایک کام کے سلسلے میں ان سے نواب خسرو جنگ وزیر دربار ریاست جموں و کشمیر کے نام ایک تعارفی خط منگوایا تھا اور انھوں نے اپنی مہربانی سے فوراً بھیج دیا تھا مگر اس زمانے میں خسرو جنگ ریاست سے کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ اس لئے اس خط سے کوئی کام نہ لے سکا تھا۔ یہ خسرو جنگ، نواب سر افسر الملک سپہ سالار افواج نظام کے بیٹے تھے۔ افسر الملک مرحوم حیدرآباد کے وہی رئیس ہیں جن کے نام پر مولوی صاحب نے اپنے ابتدائی

دور میں "افسر" نامی ایک رسالہ حیدرآباد دکن سے جاری کیا تھا۔ اس کے [illegible] کے بعد خلاف توقع ایک روز
اورنگ آباد سے مولوی صاحب کا خط وصول ہوا کہ میں جلد از جلد اورنگ آباد پہونچ کر انجمن ترقی اردو
کے انتظامات سنبھال لوں۔ چنانچہ میں مولوی صاحب کی ہدایت پر اپنے ہاں سے اورنگ آباد جا پہنچا۔ ابتدا
میں انھوں نے مجھے ریاست حیدرآباد کے اسکولوں میں انجمن ترقی اردو کے مقرر کردہ اردو کورس "درسیہ تحفہ"
کی سات ریڈریں شرح لکھنے کے لئے دیں جب میں اس کام سے فارغ ہو گیا تو انھوں نے انجمن کا انتظامی
چارج لینے کی ہدایت فرمائی۔ اس دوران میں مجھ سے انجمن کے بعض ملازموں اور اورنگ آباد کے بعض لوگوں
نے بتایا کہ یہ انجمن سازشوں کا اڈہ بنی ہوئی ہے اور مولوی صاحب کے اردگرد مطلب پرست اور
خود غرض مصاحبوں کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ یہ لوگ انجمن میں کسی صحیح آدمی کو ٹکنے نہیں دیتے اور طرح طرح
کی سازشیں کرتے رہتے ہیں اور چونکہ ان لوگوں کی ساری زندگی کا انحصار مولوی صاحب کی خوشنودی
پر ہے اس لئے یہ لوگ ان کے مزاج کے اُتار چڑھاؤ سے خوب واقف ہیں۔ اور مولوی صاحب
کس آدمی سے کس طرح لڑا دینا اس فن میں ایسی مہارت رکھتے ہیں کہ تم تو خیر ایک ناتجربہ کار نوجوان
ہو۔ انھوں نے بڑے بڑے تجربہ کار جغادری بڈھوں کو بھی ناکوں چنے چبوا دیئے ہیں۔ تمہارے حق میں
بہتر یہی ہے کہ جہاں سے آئے ہو وہیں واپس چلے جاؤ ورنہ کسی الجھاؤ میں پڑ جاؤ گے۔ یہ نظام
کا معاملہ ہے، برٹش انڈیا نہیں ہے۔ ادھر میں یہ سب کچھ سن رہا تھا اور ادھر مولوی صاحب کا
اصرار تھا کہ میں جلد از جلد انجمن کے انتظام کا چارج لے لوں۔ اب میں کشمکش و پنج میں مبتلا ہو گیا
کیا کیا جائے اور کیا نہ کیا جائے۔ اس سلسلے میں اب روز بروز مولوی صاحب کا اصرار بڑھنے لگا
آخر کار بہت غور و فکر کے بعد میں نے مولوی صاحب سے کہا کہ اگر آپ تحریری طور پر مجھے مکمل انتظامی
اختیارات سپرد کر دیں تو میں یہ ذمہ داری قبول کرنے پر تیار ہوں ورنہ مجھے اس خدمت سے معذور
سمجھا جائے، ویسے میں آپ کی انجمن اور آپ کی ذاتی خدمت جو [illegible] کر سکوں گا وہ ضرور کروں گا۔ اس پر
مولوی صاحب نے تحریری طور پر تمام انتظامی اختیارات میرے سپرد کر دیئے اور انجمن کے کارکنوں
کے نام ایک گشتی مراسلہ نکال دیا کہ جملہ انتظامی امور میں میرا حکم ماننا سب کا فرض ہو گا۔ میں نے انجمن
کے انتظام کا چارج لیتے ہی انجمن کے تمام ملازموں سے ان کی تکالیف اور مطالبات کے متعلق
ضروری معلومات حاصل کیں اور مولوی صاحب سے سفارش کی کہ ان کی ساری شکایتوں کا

کرا دیا۔ اس کے بعد سب کو جمع کرکے میں نے کہا کہ اگر اب بھی آپ حضرات کو کسی قسم کی کوئی شکایت انجمن سے ہو تو براہ کرم مطلع فرما دیجیے تاکہ اس شکایت کے دور کرنے کا بندوبست کیا جائے یا اگر کسی صاحب کو نئے نظام کے تحت اس ادارہ میں کام کرنا پسند نہ ہو تو وہ ازراہ کرم اپنا استعفا پیش کردیں۔ ان کا استعفا فی الفور منظور کرلیا جائے گا۔ سب نے یک زبان ہو کر باقاعدہ تعاون کرنے کا وعدہ کیا۔ اب میں نے کتابوں کے اسٹاک کی حالت دیکھی تو بہت سی کتابوں کو دیمک چاٹ گئی تھی اور کتابوں کی ایک بڑی تعداد بہت زمانے سے خستہ حالت میں پڑی ہوئی تھی جس کے بیچنے کا کوئی انتظام نہ کیا گیا تھا۔ ایسی کتابوں میں "دیوانِ غالب نسخۂ حمیدیہ" کی جلدیں بھی شامل تھیں۔ بہت غور و فکر کے بعد میں نے ایک طرف ہندوستان کے اخبارات و رسائل میں ان کتابوں کے اشتہارات چھپوانے کا انتظام کیا اور دوسری طرف ہندوستان کے مختلف کتاب فروشوں کے ذریعہ انجمن کی کتابوں کی نکاسی کا بندوبست کیا۔ کتابوں کے اسٹاک کا معائنہ کرنے کے بعد جب پریس کا جائزہ لیا گیا تو عجب تماشا نظر آیا وہاں عرصۂ دراز سے کسی نامکمل کتاب کے چھپے ہوئے فرمے بے ترتیب پڑے ہوئے تھے۔ اس طرح کے فرموں میں "اسٹینڈرڈ انگلش اردو ڈکشنری" اور اس کا اختصار "اسٹوڈنٹس انگلش اردو ڈکشنری" کے کچھ چھپے ہوئے فرمے بھی شامل تھے۔ بغرض کہ کسی نہ کسی طرح ان نامکمل کتابوں کو پورا چھاپ کر شایع کرنے کا انتظام کیا گیا۔ انجمن کا صدر دفتر اورنگ آباد میں تھا۔ مگر مولوی صاحب جامعۂ عثمانیہ کے شعبۂ اردو کے صدر تھے اس لئے وہ حیدرآباد ہی میں رہا کرتے تھے۔ جب یونیورسٹی کی تعطیل ہوتی تو وہ اورنگ آباد آجایا کرتے تھے اور انجمن کے کاموں کو دیکھا کرتے تھے۔ ان کی غیر حاضری میں سارا کام انجمن کے انتظام کنندہ ہی کو کرنا پڑتا تھا۔ انجمن کے کام کی نوعیت یہ تھی کہ خالص انتظامی امور نگران کے ذمے ہوتے تھے اور مالی امور براہِ راست ناظم (مولوی عبدالحق) کے ذمے ہوتے تھے۔ چونکہ اب اردو اور ہندی کی کشمکش روز بروز بڑھتی چلی جارہی تھی۔ اس لئے انجمن کے دوسرے کاموں کے علاوہ صدر دفتر اورنگ آباد میں اُردو کے پرچے گنڈے اور جلسوں کا نیا کام بھی شروع ہوا۔ اس زمانے میں اردو کے متعلق اعداد و شمار جمع کرنے کا ایک اور نیا کام شروع کیا گیا اور اس کام کے لئے بھوپال کے سید ظہور ہاشمی صاحب کو مقرر کیا گیا۔ سید ظہور ہاشمی آیندہ چل کر اس ریاست کے وزیر ہو گئے تھے۔ علاوہ بریں اس دوران میں

مولوی صاحب نے اردو کی توسیع واشاعت کے سلسلے میں ہندوستان کے طول وعرض کا دورہ کرنا بھی شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ صدر دفتر پر کام کا بار بڑھتا چلا جاتا تھا مگر مولوی صاحب مزید اسٹاف بڑھانے پر آمادہ نہ ہوتے تھے۔ اس موقع پر اورنگ آباد کے بعض اردو دوست نوجوانوں نے انجمن کے بعض کاموں میں اعزازی طور پر قابلِ قدر خدمات انجام دیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مولوی صاحب میں بہت اچھی تنظیمی صلاحیت موجود تھی۔ وہ انجمن کے مفاد میں مختلف الخیال اور مختلف المزاج نیز متضاد قسم کی صلاحیتوں کے آدمیوں کو ایک ہی رشتے میں منسلک کر کے کام کرانا خوب جانتے تھے' اور انھیں یہ گر بھی خوب آتا تھا کہ روپیہ کہاں سے اور کس طرح جمع کیا جائے۔ میں نے جن پبلک کام کرنے والوں کو دیکھا ہے ان میں مہاتما گاندھی مولانا شوکت علی اور مولوی عبدالحق تین ایسے اصحاب نظر آئے جو پبلک کاموں کے لئے روپیہ جمع کرنے میں ایک طرح سے "جینیس" کہلانے کے مستحق تھے۔ لیکن مولوی صاحب میں انتظامی صلاحیت مطلق نہ تھی۔ وہ کان کے کچے بھی تھے اس لئے اپنی مطلب براری کے لئے ان کے مصاحب جن میں دو ایک ٹوٹے پھوٹے اہلِ قلم بھی تھے' ہمیشہ دراندازیاں کرتے اور انجمن کا کام چلتے چلتے یک بیک اُلجھ جاتا تھا۔ اس وقت تک انجمن صرف ایک علمی ادارے کا نام تھا۔ مگر اب وہ ایک تبلیغی انجمن بھی بن گئی تھی۔

اصل میں انجمن کی "نشاۃ ثانیہ" کا خیال اس وقت ہی پیدا ہو چکا تھا جب ۱۹۳۴ء میں بمقام ناگ پور "ساہتیہ پرشد" کا اجلاس منعقد ہوا تھا۔ مولوی عبدالحق نے اُردو کے دوسرے دور اندیش حامیوں کے مشورے سے ۱۹۳۶ء میں انجمن ترقی اردو کی جانب سے علی گڑھ میں آل انڈیا اردو کانفرنس کے اجلاس طلب کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اردو کانفرنس کے اجلاس نہایت کامیاب رہے اور یہاں اردو کی توسیع واشاعت کا ایک نیا پروگرام منظور ہوا۔ اور یہ فیصلہ کیا گیا کہ موجودہ حالات کا لحاظ کرتے ہوئے انجمن کا صدر دفتر اورنگ آباد سے دلی منتقل کر دیا جائے اور انجمن کے نام کے ساتھ "ہند" کا اضافہ کر دیا جائے۔ یہ کانفرنس ۱۹۳۶ء میں منعقد ہوئی تھی۔ غرض کہ انجمن کی زندگی میں اب ایک نیا موڑ آیا اور انجمن نے پرانا جامہ اتار کے نیا بانا پہنا۔ اس بیچ میں جب کبھی حیدرآباد جاتا وہاں مولوی صاحب کے مکان پر حسبِ سابق ترین

حکام کی بھیڑ بھاڑ نظر آتی اور لوگ ان سے نہایت ہی خوشامدانہ انداز میں جھک کر ملا کرتے تھے۔ اسی طرح جب کبھی مولوی صاحب اورنگ آباد تشریف لاتے یہاں بھی اسی طرح کے لوگ انھیں گھیرے رہتے۔ ریاست حیدرآباد میں قدم رکھنے سے پہلے میں انھیں صرف اردو کا عالم و ادیب اور انجمن ترقی اردو کا کرتا دھرتا سمجھتا تھا لیکن ریاست حیدرآباد کے قیام نے بتا دیا کہ وہ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہیں۔ ان کی ثانوی حیثیت کے متعلق لوگوں نے بہت سی دلچسپ حکایتیں سنائیں۔ مثلاً یہ کہ مہاراجہ کشن پرشاد نے بعض لوگوں کو عثمان علی خاں کے ایامِ شہزادگی میں ایسے خطوط لکھے تھے جن میں عثمان علی خاں کی مخالفت کی گئی تھی۔ اس لئے (ان کی تخت نشینی کے بعد) وہ زیادہ پریشان رہتے تھے۔ اسی بیچ میں ایک بار مولوی عبدالحق ایک شخص کے ہاں ایک خاص دعوت میں شریک ہوئے۔ یہاں انھیں دورانِ گفتگو میں اتفاقیہ طور پر یہ معلوم ہوا کہ مہاراجہ کے اس طرح کے سارے خط فلاں شخص کے پاس موجود ہیں۔ اتفاق کی بات ہے کہ وہ آدمی مولوی صاحب کا خاص ملاقاتی تھا۔ چنانچہ دعوت ختم ہونے کے بعد مولوی صاحب رات گئے اس شخص کے مکان پر پہنچے۔ سوتے سے اٹھا کر مہاراجہ کے سارے خطوط طلب کئے۔ اس شخص پر آدھی رات کو اس طرح یک بیک مولوی صاحب کے پہنچنے اور خطوط طلب کرنے کا کچھ ایسا رعب طاری ہوا کہ اس نے سارے خطوط مولوی صاحب کے حوالے کر دیے۔ یہاں سے وہ سیدھے مہاراجہ کشن پرشاد کے محل پہنچے اور چوب داروں سے کہا کہ مجھے ایک نہایت ضروری کام سے اسی وقت مہاراجہ سے ملنا ہے۔ آخر کچھ رد و کد کے بعد مہاراجہ کو محل سرا کے اندر اطلاع کرائی گئی اور وہ شب خوابی کے کپڑے پہنے آنکھیں ملتے ہوئے محل سرا سے برآمد ہوئے اور مولوی صاحب سے ملے۔ مولوی صاحب نے تخلیہ کرا کے یہ سارے خطوط مہاراجہ کے سامنے پیش کئے اور ان سب کو اپنے سامنے جلوا دیا۔ یہ کہنا بے کار ہے کہ اس واقعہ کے بعد مہاراجہ ساری زندگی مولوی صاحب کے ممنون رہے۔ مجھے یہاں ایک دلچسپ قصہ یہ معلوم ہوا کہ مولوی عبدالحلیم شرر، مولوی عزیز مرزا مترجم دکرم اُردسی، مولوی ظفر علی خاں، مولوی عبدالحق اور دو چار اور دوسرے آدمی حیدرآباد میں شام کو اکثر جمع ہو جاتے اور دنیا جہان کے مسئلوں پر بحث مباحثے کیا کرتے تھے۔ ایک بار مولانا ظفر علی خاں نے انگریزوں کے خلاف پان اسلامزم سے تعلق رکھنے والی کوئی اسکیم بنائی۔ وہ اسکیم

نظام کی خدمت میں خود لے جاکر پیش کردی یا کسی اور سے پیش کرادی۔ شدہ شدہ یہ خبر برطانوی ریذیڈنٹ کو جا پہنچی۔ اب عزیز مرزا عبدالحلیم شرر، ظفر علی خاں اور ایک اور شخص کو جس کا نام میں بھول گیا ہوں چوبیس گھنٹے کے اندر ریاست حیدرآباد سے نکل جانے کا حکم ملا اور مولوی عبدالحق کا شہر حیدرآباد میں داخلہ ممنوع قرار دیا گیا۔

مولوی صاحب کی ہمت مردانہ سے تعلق رکھنے والا اسی طرح کا ایک اور واقعہ یاد آیا۔ وہ یہ کہ جس زمانہ میں وہ ناظم دارالترجمہ کے عہدے پر ممتاز تھے، اس دور میں یو۔پی کے ایک وظیفہ یاب پولیس افسر حیدرآباد آئے اور وہ اپنے ساتھ نظام کی شان میں ایک قصیدہ لکھ کر لے آئے۔ یہاں پہنچ کر انھوں نے کسی نہ کسی طرح "بارگاہِ سلطانی" میں باریابی حاصل کرلی اور نظام کی خدمت میں قصیدۂ مدحیہ پیش کیا۔ نظام قصیدہ سُن کر بہت خوش ہوئے اور انھیں آیندہ بھی "بارگاہِ سلطانی" میں حاضر ہونے کی ہدایت کردی۔ اس کے بعد وہ چار مرتبہ نظام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور چوتھی حاضری میں والیٔ ریاست سے اپنے وطن واپس جانے کی اجازت طلب کی۔ یہ سُن کر نظام نے اُن سے حیرت سے دریافت کیا۔ "تمھیں یہ شہر پسند نہیں ہے؟" جس پر انھوں نے کہا "سرکار میری کیا ہستی یہ شہر مجھے کیا دنیا کے ہر شخص کو پسند آئے گا۔" اس پر نظام نے پوچھا پھر تم یہاں سے واپس کیوں جانا چاہتے ہو؟ اس پر انھوں نے کہا کہ یہاں زندگی بسر کرنے کے لیے میرے پاس کوئی وسیلہ نہیں ہے۔ نظام نے کہا: "یہ کون سی بڑی بات ہے ابھی وسیلہ پیدا ہوا جاتا ہے۔" اور صدرالمہام پیشی مبارک (وزیر دربار) کو حکم دیا کہ خالی اسامیوں کی فہرست فوراً پیش کی جائے۔ ریاست میں قاعدہ تھا کہ جو بڑی ملازمتیں خالی رہتی تھیں ہمیشہ نظام کو ان کی فہرست بھیج دی جاتی تھی۔ نظام نے جب اس فہرست پر نظر ڈالی تو ملازمتوں کے ساتھ دارالترجمہ میں ایک رکن کی جگہ خالی نظر آئی تو نظام نے یہ سمجھ کر کہ یہ شاعر اور پڑھے لکھے آدمی ہیں فوراً صدرالمہام پیشی کو حکم دیا کہ ناظم دارالترجمہ کے نام یہ حکم جاری کیا جائے کہ اس عہدے پر ان کا تقرر کیا جاتا ہے۔ یہ صاحب نظام کا حکم نامہ لے کر خوشی خوشی مولوی عبدالحق کے دفتر پہنچے۔ اور یہ سرکاری حکم نامہ مولوی صاحب کے حوالے کیا۔ مولوی صاحب نے اسے پڑھ کر ان کی تعلیمی حالت اور ترجمہ کے کام میں ان کے تجربے کے متعلق استفسار کیا۔ انھوں نے کہا کہ میری تعلیم بہت تھوڑی

ہوئی ہے' اور میں نے اس سے پیشتر ترجمہ کا کبھی کوئی کام نہیں کیا ہے۔ یہ سن کر مولوی
صاحب نے کہا تو پھر اس عہدے پر آپ کا تقرر نہیں ہو سکتا۔ یہ اپنا سا منہ لے کر وفیہ کے پاس
پہنچے اور پوری روداد سنادی ادھر مولوی صاحب سمجھ گئے کہ اب مجھ پر ضرور نظام کا عتاب
نازل ہوگا۔ چنانچہ انھوں نے استعفا لکھا اور سیدھے وزیراعظم کی ڈیوڑھی پر جا پہنچے، اور
ساری کیفیت وزیراعظم کے گوش گذار کی اور اپنا استعفا بھی پیش کر دیا۔ وزیراعظم نے
مولوی صاحب کا استعفا یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ آپ اپنا کام اطمینان سے کیجئے۔ میں اعلیٰ حضرت
سے نپٹ لوں گا۔ مولوی عبدالحق کے جانے کے بعد وزیراعظم سیدھے کنگ کوٹھی کی طرف روانہ ہوئے
اس دوران میں یوپی کے چند وظیفہ یافتہ پولیس افسر صدرالمہام پیشی سے جا کر ملے اور سارا
ماجرا ان کے گوش گزار کر دیا۔ صدرالمہام نے یہ بات نظام کی خدمت میں عرض کی۔ نظام آگ
بگولہ ہوگیا اور اس نے غضب ناک ہو کر صدرالمہام پیشی کو حکم دیا کہ فوراً اس بد دماغ شخص کی
برطرفی کے احکام جاری کیے جائیں۔ اتنے میں وزیراعظم بارگاہ سلطانی میں پہنچ گئے اور کچھ دیر
ادھر ادھر کے سرکاری کاموں کا تذکرہ کرتے ہوئے انھوں نے عرض کیا کہ حضور عالی نے دارالترجمہ
میں جس شخص کا تقرر فرمایا تھا وہ نہایت بے دار مغز اور اعلیٰ دماغ انسان ہے۔ اگر دارالترجمہ
جیسے معمولی ادارے میں اس شخص کا تقرر کیا گیا تو ریاست اس کی غیر معمولی قابلیت کے فیض سے
محروم رہ جائے گی۔ لہذا میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اس شخص کو فلاں محکمے کا ڈائرکٹر بنایا جائے۔ یہ سن کر
نظام بہت خوش ہوا اور کہا واقعی تمھاری تجویز بہت مناسب ہے۔ تاہم اس بے مغز ناظم دارالترجمہ
کو تنبیہ کردی جائے کہ وہ آئندہ احکام شاہی سے سرتابی کی جرأت نہ کرے۔

مولوی صاحب کو انجمن کے لئے چندہ جمع کرنے اور وظائف لینے میں بھی کمال حاصل تھا۔
اس سلسلے میں انھیں نئی نئی باتیں سوجھتی تھیں اور حق یہ ہے کہ خوب سوجھتی تھیں۔ اس زمانے میں
حیدرآباد کے ادبی حلقوں میں یہ شکایت عام تھی کہ دنیا کی دوسری زبانوں کے کلاسیکی ادب کی
بہت تھوڑی ہی ایسی کتابیں ہیں جن کا براہ راست متعلقہ زبانوں سے اردو میں ترجمہ کیا گیا ہے
[illegible] مولوی صاحب کے کانوں میں بھی پڑی۔ انھوں نے فوراً ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری
کو اس زمانے میں انجمن ترقی اردو کی سٹینڈرڈ انگلش اردو ڈکشنری اور اسٹوڈنٹس انگلش

اردو ڈکشنری کے کام کے سلسلے میں حیدرآباد میں مقیم تھے یہ کہا کہ دنیا کی مستند زبانوں کی ایسی
کلاسیکی کتابوں کی ایک فہرست بناؤ جن کا اب تک اُردو میں ترجمہ نہیں ہوا ہے، جب یہ فہرست
تیار ہوگئی تو مولوی صاحب نے یہ فہرست رسالہ "اردو" میں چھاپ دی اور اس رسالے کی ایک
کاپی کے ساتھ وزیر اعظم کو درخواست پیش کی کہ انجمن یہ کتابیں شائع کرنا چاہتی ہے۔ حکومت
اس کے لئے گرانٹ عطا کرے۔ دارالترجمہ کے ارباب حل وعقد نے بھی اس سلسلے میں بہت
دوڑ دھوپ کی مگر کامیابی کا سہرا مولوی صاحب ہی کے سر بندھا اور چالیس ہزار روپے کی
گرانٹ منظور ہوگئی۔

اس طرح کا ایک دلچسپ واقعہ اور یاد آیا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب مولوی صاحب
انجمن کے ساتھ دلی چلے گئے تھے اور میں بمبئی میں رہتا تھا۔ اس زمانے میں مولوی صاحب کبھی کبھی
اپنے کاموں سے بمبئی آیا کرتے تھے اور آنے سے پیشتر مجھے ضرور اطلاع دے دیا کرتے تھے۔ اس
زمانے میں دوسری جنگِ عظیم زور شور سے جاری تھی۔ اس دور میں مہاراجہ سر ہری سنگھ والئی جموں
وکشمیر زیادہ تر بمبئی میں رہا کرتے تھے انھوں نے مالابار ہل پر ایک مکان تعمیر کرایا تھا اور اس کا نام
"کشمیر ہاؤس" رکھا تھا۔ راج کمار کرن سنگھ بمبئی کے ایک پبلک اسکول میں عام لڑکوں کے ساتھ تعلیم حاصل
کرتے تھے۔ سر کیلاش نرائن ہکسر سابق وزیر اعظم گوالیار راج کمار کے اتالیق اور مہاراجہ کے مشیر تھے
انھیں اردو شاعری سے خاص لگاؤ تھا اسی رشتے سے میری ان سے راہ و رسم تھی اور کبھی کبھی میں
کشمیر ہاؤس چلا جایا کرتا تھا۔ اتفاقاً مولوی صاحب کے بمبئی کے دورانِ قیام میں مولوی صاحب
سے سر کیلاش نرائن کا تذکرہ آگیا۔ مولوی صاحب نے فرمایا کہ مجھ سے اُن سے دلی میں ملاقات
ہوچکی ہے کوئی ایسی تدبیر نکالو کہ وہ مہاراجہ سے انجمن کے لئے چندہ دلوا دیں۔ اس پر میں نے کہا کہ
اس سے پیشتر کہ میں انھیں چندے کے متعلق کچھ کہوں ایک بار ان سے آپ کی ملاقات ہو جانا
ضروری ہے۔ مولوی صاحب اس پر راضی ہوگئے۔ دوسرے دن میں نے سر کیلاش نرائن کو فون کیا
اور انھیں بتایا کہ مولوی عبدالحق آج کل بمبئی آئے ہوئے ہیں اگر آپ کوئی وقت نکالیں تو ایک
دلچسپ صحبت رہے گی۔ سر کیلاش نرائن نے دوسرے دن شام کا وقت بتایا اور یہ طے ہوا
کہ اپولو بندر پر گرینس ہوٹل میں اکٹھے چائے پئیں گے۔ دوسرے دن چائے پر کیلاش نرائن

اور مولوی صاحب کی ملاقات ہوئی اور دو گھنٹے تک یہ پُر لطف صحبت قائم رہی۔ اس ملاقات کے دو چار روز بعد مولوی صاحب واپس دلّی چلے گئے اور جاتے ہوئے یہ کہہ گئے کہ سرکیلاش ناراین ہکسر سے ملتے رہنا۔ میں نے کہا آپ مطمئن رہیے، مجھ سے جو کوشش ہو سکے گی ضرور کروں گا۔ چند روز کے بعد میں نے سرکیلاش کو انجمن کی امداد کی طرف متوجہ کیا۔ انھوں نے مہاراجہ سے بات کرنے کے بعد مجھے اس ضمن میں مطلع کرنے کا وعدہ کیا۔ چند روز کے بعد جب ملاقات ہوئی تو انھوں نے کہا میں نے مہاراجہ سے انجمن کی امداد کے بارے میں بات چیت کر لی ہے۔ وہ آئندہ مہینے کی فلاں تاریخوں میں بمبئی میں مقیم رہیں گے تم مولوی صاحب کو اطلاع دے دو اور ان کو یہ بھی لکھ دو کہ آتے ہوئے انجمن کی کچھ کتابیں مہاراجہ کو تحفۃً پیش کرنے کے لئے ساتھ لیتے آئیں۔ میں نے کیلاش ناراین صاحب کی ہدایت کے مطابق مولوی صاحب کو خط لکھ دیا اور مطلوبہ تاریخوں میں مولوی صاحب بمبئی پہنچ گئے میں نے سرکیلاش کو ان کی آمد کی اطلاع دے دی۔ کیلاش نے کہا کہ میں مہاراجہ سے پوچھ کر ملاقات کا وقت مقرر کر کے تمھیں اطلاع دیتا ہوں۔ چناں چہ انھوں نے دوسرے دن ہمیں چائے پر بلوا لیا۔ میں اپنے ایک ملاقاتی بڑے تاجر کے یہاں سے چاندی کا ایک بڑا طشت لے آیا۔ اُس میں انجمن کی مطبوعات رکھی گئیں اور اُس پر ایک نہایت خوب صورت اور قیمتی زربفت کا سرپوش ڈھانک دیا گیا اور اب میں اور مولوی صاحب ایک تہذیب یافتہ ملازم کو ساتھ لے کر وقتِ مقررہ پر "کشمیر ہاؤس" پہنچے سرکیلاش کو اطلاع کر دی گئی۔ انھوں نے اپنے ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ اب مہاراجہ کو اطلاع ہوئی۔ مہاراجہ نے ہمیں اپنی لائبریری میں بلوا لیا۔ یہاں مہاراجہ سے تعارف ہوا۔ میں نے وہ طشت مہاراجہ کے سامنے ٹیبل پر رکھوایا اور سرپوش اٹھایا۔ مہاراجہ ایک ایک کتاب کو اٹھا کر دیکھتے رہے اور باری باری سے ہر کتاب کے مضمون کے بارے میں پوچھتے رہے۔ میں نے ہر کتاب کے متعلق ضروری معلومات مہاراجہ کے گوش گزار کیں۔ جب وہ ساری کتابیں اُلٹ پلٹ کر دیکھ چکے تو پھر ہمیں لے کر چائے کے کمرے میں گئے۔ میز کیک، پیسٹری، بسکٹ اور طرح طرح کے میووں سے بھری ہوئی تھی۔ اس ٹیبل پر کچھ اردو ادب اور کچھ کشمیر میں اردو کی پوزیشن پر گفتگو ہوتی رہی اور یہ گفتگو گھنٹے بھر تک جاری رہی۔ اب مہاراجہ نے ہمیں بڑے تپاک سے رخصت کیا۔

سر کیلاش انھیں لفٹ تک لیکر آئے اور فرمایا کہ آپ دونوں پہلی منزل پر میرے ڈرائنگ روم میں انتظار کریں میں ابھی حاضر ہوتا ہوں۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس تشریف لائے اور انھوں نے مولوی صاحب کو ایک بڑا لفافہ یہ کہہ کر دیا کہ مہاراجہ نے انجمن کو چالیس ہزار روپیہ دینا منظور فرمایا ہے۔ سردست دس ہزار پیش کئے جاتے ہیں۔ بقیہ رقم آپ کو دلّی میں مل جائے گی اس کے دو روز بعد مولوی صاحب ہنسی خوشی دلّی تشریف لے گئے اور دلّی پہنچ کر انھوں نے اعلان کیا کہ انجمن کی جو عمارت وہ بنوانا چاہتے ہیں اس کے ہال کا نام "کشمیر ہال" رکھا جائے گا۔ کچھ عرصے کے بعد مولوی صاحب کو بقیہ تیس ہزار روپے بھی مل گئے اور آئندہ چل کر انھوں نے سر کیلاش کو انجمن کی مجلس نظما، میں بھی شامل کر لیا۔

انسانی حیثیت سے مولوی صاحب میں بعض بہت بڑی خوبیاں تھیں خلاصہ یہ کہ ان میں انتہا صبر و ضبط کا مادّہ تھا جوانی میں انھیں کبھی قولنج کا مرض ہو گیا تھا کہ ڈاکٹروں نے چاول کھانے کی ممانعت کر دی تھی۔ یہ مرض اچھا ہو گیا مگر بعد میں پھر انھوں نے کبھی چاول کا ایک دانہ بھی زبان پر نہ رکھا۔ اورنگ آباد، حیدرآباد اور بمبئی میں بہت سے ایسے موقعے آئے کہ کھانے کی میز پر دو چیزوں کے ساتھ چاول کے پکوان موجود ہیں مگر میں نے انھیں کبھی چاول کھاتے نہیں دیکھا۔ ان کے صبر و ضبط کے متعلق ایک اور واقعہ یاد آیا۔ - - - - - - - وہ یہ کہ ایک مرتبہ جب کہ وہ اورنگ آباد میں مقیم تھے۔ وہ کچھ لوگوں کے ساتھ اپنے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ادھر ادھر کی باتیں ہو رہی تھیں۔ اتنے میں وہ اپنے کمرے میں کچھ لینے کے لئے گئے اور میز پر سے کوئی چیز اٹھانے لگے۔ وہاں ایک بچھو بیٹھا ہوا تھا؟ اس نے ڈنک مار دیا۔ یہ اسی طرح خاموش بیٹھے رہے جب ان کے برآمد ہونے میں دیر ہوئی تو حاضرین میں سے ایک صاحب اندر اٹھ کر گئے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ مولوی صاحب ایک انگلی پکڑے ہوئے بیٹھے ہیں۔ ان صاحب نے ان سے پوچھا "مولوی صاحب خیر تو ہے انگلی پر؟" انھوں نے فرمایا "کچھ نہیں بچھو نے ڈنک مار دیا ہے"۔ اس پر ان صاحب نے کہا "آپ کو آواز دینی چاہئے تھی"۔ اس پر مولوی صاحب نے کہا اس کی کیا ضرورت تھی معمولی سی بات ہے تھوڑا بچھو کا زہر اتارنے کی دوا منگوا کر ہاتھ پر لگوا لی گئی۔ اگر ان کی بجائے کوئی دوسرا ہوتا تو بچھو کا ڈنک کھا کر چیخ اٹھتا۔

مولوی صاحب کو اچھے کھانوں کا بڑا شوق تھا۔ وہ نہایت نفیس کھانے پکواتے خود بھی کھاتے اور دوسروں کو بھی کھلاتے بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ وہ بدمزہ کھانے کھا ہی نہیں سکتے تھے۔ مغربی اور مشرقی دونوں طرز کے کھانوں میں اُن کا ذوق نہایت پاکیزہ اور نکھرا ہوا تھا۔ ایک بار میں اور مولوی صاحب انجمن کے ایک کام سے اورنگ آباد سے بمبئی گئے۔ وہاں میرے محترم دوست افتخار علی صاحب، برادر فیاض علی مرحوم مصنف "شمیم" "انور" نے فلورا فاؤنٹین پر "انڈیا کافی ہاؤس" کے نام سے ایک حیدرآبادی صاحب کی شرکت میں نہایت نفیس ہوٹل قائم کیا تھا۔ اس ہوٹل میں بمبئی کے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور مہذب و شائستہ لوگوں کا مجمع لگا رہتا تھا۔ افتخار صاحب نے مجھ سے مولوی صاحب سے ملنے کی خواہش ظاہر کی میں نے مولوی صاحب سے افتخار صاحب کا تعارف کرا دیا۔ افتخار صاحب نے بہت اصرار سے رات کے کھانے پر مولوی صاحب کو مدعو کیا، مولوی صاحب صرف رات ہی کو کھانا کھایا کرتے تھے، دوپہر کو کچھ نہ کھاتے تھے۔ البتہ صبح کا ہلکا سا ناشتہ کر لیتے تھے اور شام کو چائے پی لیا کرتے تھے۔ خیر ہم رات کو "انڈیا کافی ہاؤس" کھانا کھانے کے لئے پہنچے۔ جب وہاں سے کھانا کھا کر باہر نکلے تو راستے میں مولوی صاحب نے فرمایا "آج ہم نے اور تم نے جلاب پی لیا ہے۔" میں چکرایا کہ یہ کیا بات ہے اور مولوی صاحب سے عرض کیا کہ آپ کیا فرما رہے ہیں؟ ہم نے تو کوئی جلاب نہیں پیا۔ یہ سُن کر انھوں نے فرمایا "تعجب ہے کہ تم جلاب پی کر انکار کر رہے ہو۔" اب مجھے اور زیادہ حیرت ہوئی اور میں نے پوچھا آپ یہ کیا فرما رہے ہیں! اس پر مولوی صاحب نے کہا "وہ جو افتخار نے کھانے سے پہلے ہمیں لعاب دار سا وہ پلایا تھا وہ جلاب نہیں تو اور کیا تھا؟" اب میں سمجھ گیا کہ مولوی صاحب کا اشارہ اس سُوپ کی طرف ہے جو افتخار نے ہمیں پلایا تھا اور یہ سُوپ مولوی صاحب کو پسند نہ آیا۔

مولوی صاحب غذاؤں کے متعلق بھی دلچسپ تجربے کیا کرتے تھے۔ ایک روز میں اورنگ آباد میں اپنے کمرے میں سو رہا تھا۔ برسات کا موسم تھا۔ رات کو تھوڑے تھوڑے وقفے سے مجھے کچھ مینڈکوں کے ٹرانے کی آوازیں آتی تھیں۔ میں بار بار لالٹین لے کر پچھواڑے جاتا اور پھر باہر نکل کر دیکھتا لیکن مینڈک کہیں بھی دکھائی نہ دیتے تھے۔ ساری رات یہی

کیفیت جاری رہی۔ صبح اٹھ کر میں نے برسبیل تذکرہ باورچی سے یہ بات کہی۔ باورچی نے کہا کل شام مولوی صاحب نے کچھ مینڈک پکڑوا کر منگوائے تھے وہ آپ کے کمرے سے پیچھے والے کمرے میں ایک گھڑے میں رکھے گئے ہیں۔ مجھے حکم ملا ہے کہ روزانہ شام کو ایک مینڈک کا سوپ تیار کیا کروں میں نے فوراً وہ گھڑا باہر منگوایا اور لاٹھی مار کر گھڑے کو توڑ دیا۔ اس میں سے سات آٹھ سیاہ رنگ کے بڑے بڑے مینڈک نکل کر اِدھر اُدھر پُھدکتے ہوئے بھاگ نکلے۔ شاید دن کو یہ سانحہ باورچی نے کسی وقت مولوی صاحب کے گوش گزار کر دیا۔ رات کے کھانے پر انھوں نے سیاہ مینڈک کے گوشت کے فوائد پر ایک دلچسپ تقریر شروع کی۔ جب مولوی صاحب کی تقریر ختم ہو گئی تو میں نے نہایت سنجیدگی سے عرض کیا کہ جب تک میں اس گھر میں مقیم ہوں، مینڈک یہاں نہیں پک سکتے اس کے بعد پھر کبھی انھوں نے مینڈک کا تذکرہ نہیں کیا۔

مولوی صاحب کو حفظانِ صحت کا بہت خیال لگا رہتا تھا، اور وہ کام کی طرح یہ بھی پابندی سے کیا کرتے تھے۔ علاوہ بریں انھیں عمر بڑھانے اور اعادہ شباب کے مسئلے سے بھی بڑی دلچسپی تھی۔ اورنگ آباد میں ایک پنڈت جی تھے، مولوی صاحب نے کسی زمانے میں ان سے تلسی داس جی کی رامائن کا پاٹھ لیا تھا۔ پنڈت جی کا قد درمیانی اور رنگ سانولا تھا۔ داڑھی منڈاتے تھے مگر مونچھیں لمبی رکھتے تھے۔ سر پہ پگڑی باندھتے اور جسم پہ بند کالر کا لمبا کوٹ پہنتے پاؤں میں چپلی ہوتی اور ہاتھ میں لوہے کی شام لگا ہوا ایک چمک دار ڈنڈا ہوتا۔ پنڈت جی تمباکو نوشی اور ہر قسم کے نشے کے خلاف تھے۔ خود ساگ پات کھاتے اور گائے کا اُبالا ہوا دودھ پیا کرتے تھے۔ ان کی ایک صفت یہ تھی کہ صبح سویرے ایک چٹکی ترکٹی کھاتے اور رات کو سوتے وقت ایک چٹکی ترپھلا پھانک لیا کرتے تھے۔ مولوی صاحب سے عمر میں برس دو برس نکلتے ہوئے تھے مگر سر کے سارے بال سیاہ تھے اور آنکھوں کی روشنی اور دانت اپنی جگہ برقرار تھے اور سماعت میں بھی کسی طرح کا فرق نہیں آیا تھا جسم مضبوط تھا اور سینہ تان کر چلتے تھے۔

یہ پنڈت جی جب کبھی مولوی صاحب کے پاس آتے تو ہمیشہ حفظانِ صحت کے اصولوں یا عمر بڑھانے کے نسخوں پر گفتگو شروع ہو جاتی اور جب پنڈت جی ان سے مل کر چلے جاتے تو مولوی صاحب کہتے کہ صحت کو ٹھیک رکھنے کا راز پنڈت جی سے سیکھو۔ دیکھو ان کی کیسی اچھی صحت

ہے۔ اس عمر میں بھی ایسا کس بل ہے کہ اگر جوانوں کی کلائی پکڑ لیں تو چھڑانا مشکل ہو جائے۔ اگر صحت ہو تو ایسی ہو۔ میں مولوی صاحب کی گفتگو سُن کر خاموش ہو جاتا۔ کبھی کبھی پنڈت جی جے پور چلے جایا کرتے تھے۔ ایک بار وہ واپسی پر جے پور سے یہ خوش خبری لے کر آئے کہ تبت میں کیلاش پہاڑ کی کسی گُفا میں ایک ننگ دھڑنگ سادھو رہتا ہے اسے "کایا کلپ" (از سرِ نو نوجوان بنا دینے کا طریقہ) کا راز معلوم ہے۔ خود اس کی عمر ساڑھے چار سو برس سے کم نہ ہوگی۔ ہندوؤں کی مذہبی روایات کے مطابق کیلاش پہاڑ وہی مقام ہے جہاں عہدِ قدیم میں شیو جی اور پاربتی جی رہا کرتے تھے۔ یہ سُن کر مولوی صاحب بہت خوش ہوئے اور پنڈت جی سے کہا کہ چلیے ہم اور آپ دونوں وہاں چل کر کایا کلپ کرالیں۔ میں نے پنڈت جی کے سامنے تو کچھ نہ کہا مگر جب وہ چلے گئے تو میں نے مولوی صاحب سے کہا کہ یہ محض پنڈت جی کا خبط ہے۔ شاید آپ کو نہیں معلوم کہ اگر کایا کلپ کا نسخہ الٹا پڑ جائے تو سارا جسم سڑ جاتا ہے۔ پھر میں نے ہندو یونیورسٹی کے بانی پنڈت مدن موہن مالویہ کی مثال دی جنھوں نے "کایا کلپ" کرایا تھا، جس سے جوان ہونے کے بجائے وہ اور زیادہ بوڑھے ہو گئے تھے، اور پھر اس کے چند سال بعد ہی کسی مرض میں مبتلا ہو کر پرلوک یاترا کر سدھار گئے تھے۔ اس کے بعد پھر مولوی صاحب سے کایا کلپ کا تذکرہ نہیں آیا۔

مولوی صاحب تھیٹر اور سینما تو دیکھتے ہی تھے مگر انھیں اعلیٰ درجے کی موسیقی اور رقص سے بھی خاصی دل چسپی تھی۔ ایک بار وہ بمبئی آئے اور شام کو جب باہر نکلے تو میں نے پوچھا "مولانا کہاں تشریف لے جائیں گے؟" انھوں نے نہایت سنجیدگی سے فرمایا "روشن آرا کے ہاں"۔ خلافِ توقع روشن آرا کا نام سُن کر میں چونک پڑا اور بے ساختہ میری زبان سے نکل گیا "وہاں آپ کا تشریف لے جانا کچھ مناسب نہیں معلوم ہوتا۔" اس پر مولوی صاحب نے جھنجھلا کر کہا "میاں، ہم جو ان سیٹھ ساہوکاروں اور مہاراجاؤں کے پاس جاتے ہیں تو ان کے پاس روپے کے سوا اور کیا رکھا ہے؟ روشن آرا تو ایک بڑی باکمال مغنیہ ہے، میں ریڈیو پر اس کے گانے سُنا کرتا ہوں۔ اس کے شہر میں آکر، روبرو بیٹھ کر اگر اس کا گانا نہ سنوں تو مجھ پر حیف ہے۔" یہ سن کر میں نے نہایت نرمی سے عرض کیا کہ روشن آرا محفلوں میں بیٹھ کر گانے کا کام نہیں کرتی وہ اپنے گھر پر رہتی ہے اور بغیر پہلے سے وقت مقرر کیے ہوئے اس کا گانا نہیں سنا جا سکتا۔ اس پر مولوی صاحب نے فرمایا "اچھا تو پھر اس سے وقت مقرر کرو۔"

دوسرے دن میں نے بمبئی ٹاکیز کو ٹیلیفون کیا۔ اس کی گراموفون کمپنی سے میری غزلیں اور گیت ریکارڈ ہوا کرتے تھے۔ میں نے بمبئی ٹاکیز کے ایک اعلیٰ افسر سے مولوی صاحب کی اس خواہش کا اظہار کیا۔ انھوں نے کہا کہ ہم آج ہی رات کو روشن آرا بلکہ اس کے مقابلے کی اور بھی دوسری بڑی گانے والیوں کے گانے کا انتظام کرتے ہیں۔

رات کو ہم مقررہ وقت پر سرفیروز شاہ مہتہ روڈ پر بمبئی ٹاکیز کی بلڈنگ میں پہنچے یہاں معلوم ہوا کہ روشن آرا بمبئی سے کہیں باہر گئی ہوئی ہے البتہ سرسوتی بائی اور کیسر بائی کیرکر جو روشن آرا کی حریف سمجھی جاتی تھیں، موجود ہیں۔ بہرحال ہم نے رات کو دیر تک ان دونوں کا گانا سُنا۔ مولوی صاحب ان دونوں کے گانے سے پوری طرح لطف اندوز ہوئے۔ ان ہی ایام میں مدراس سے رکمنی اروندیل اپنے طائفے کے ساتھ رقص کا کمال دکھانے بمبئی آئی ہوئی تھی۔ تقسیم ہند سے پہلے رکمنی "بھارت ناٹیم" نامی ناچ میں ہندوستان بھر میں اپنا ثانی نہیں رکھتی تھی۔ میں نے مولوی صاحب سے دریافت کیا "کیا آپ رکمنی کا رقص دیکھنا پسند فرمائیں گے؟" انھوں نے کہا کہ ہاں اس کا رقص ضرور دیکھیں گے۔ میں نے دو سیٹیں فوراً بک کرالیں اور رات کو کھانا کھانے کے بعد میں اور مولوی صاحب دونوں رکمنی کا رقص دیکھنے کے لیے گئے۔ انھوں نے اس کا رقص نہایت دلچسپی کے ساتھ دیکھا۔ جب ہم رقص ختم ہونے پر باہر نکلے تو مولوی صاحب نے فرمایا قیامت کی عورت ہے ظالم کی بوٹی بوٹی ناچتی ہے۔ خوش نصیب ہے وہ مرد جس کی یہ بیوی ہے۔

مولوی صاحب جب کسی آدمی کے منہ سے اُردو کا کوئی لفظ یا محاورہ غلط سن لیتے تو اسے فوراً ٹوک دیتے یا بگڑ جاتے خواہ اس شخص کو اردو آتی ہو یا نہ آتی ہو۔ ایسے موقعوں پر کبھی کبھی خاصا ہنسنے ہنسانے کا سامان فراہم ہو جایا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ میں اور مولوی صاحب بمبئی میں کچھ موزے اور رومال وغیرہ خریدنے ایک دوکان پر گئے۔ اتفاق سے اس دوکان میں داخل ہونے کے لیے تین چار سیڑھیاں چڑھنی پڑتی تھیں۔ میں ان سیڑھیوں کے پاس کھڑا تھا اور مولوی صاحب سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ دروازے پر ایک گجراتی سیلزمین کھڑا تھا اس نے نہایت بے تکلفی سے مولوی صاحب سے پوچھنا شروع کیا: "کیا مانگتا کیا مانگتا" مولوی صاحب نے زور زور سے کہنا شروع کیا "بھیک مانگتا بھیک مانگتا" اور یہ کہتے ہوئے دوکان میں دا

ہو گئے۔ یہ سن کر دوکان میں جو دو چار اردو جاننے والے کھڑے تھے بے اختیار ہنس پڑے۔

مولوی صاحب کو نئے نئے الفاظ وضع کرنے اور نئی اصطلاحیں بنانے کا خاص ملکہ حاصل تھا۔ جب اسٹینڈرڈ انگلش اردو ڈکشنری بن رہی تھی تو کوئی شخص کلر بلائنڈ ______ (COLOUR BLIND) کے لئے کوئی مناسب لفظ نہ بنا سکا۔ یہ آنکھ کی بیماری کا نام ہے۔ آنکھ کی ایک اور بیماری ہے جس کو اردو میں "رتوندا" کہتے ہیں۔ چناں چہ مولوی صاحب نے کلر بلائنڈ کے لئے "رنگوندا" کے نام سے ایک لفظ خود وضع کر دیا اور حق یہ ہے کہ اس مرض کے مفہوم کو اردو زبان میں ادا کرنے کے لئے اس سے بہتر کوئی اور لفظ بنایا ہی نہیں جا سکتا۔

میں اس موقع پر مولوی صاحب کی بہت سی خوبیوں کے ساتھ اُن خامیوں میں سے جو میرے مشاہدے میں آئی ہیں، اگر چند کا سرسری تذکرہ نہ کروں تو یہ امر مولوی صاحب کے سوانح نگاروں پر ظلم کے مترادف ہوگا۔ مولوی صاحب حیدرآباد ۱۸۹۵ء میں میر محبوب علی کے دور حکومت میں گئے تھے۔ اس زمانے میں ریاست میں انگریزی پڑھے لکھے لوگوں کا قحط تھا۔ جو انگریزی پڑھے لکھے وہاں پہونچ جاتے تھے انھیں سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا تھا، علاوہ بریں مولوی عبدالحق اس ریاست میں جن لوگوں کی معرفت گئے تھے وہ وہاں بڑا اثر اور اقتدار رکھتے تھے حیدرآباد پہنچنے کے کچھ عرصے بعد انھیں نواب سر افسر جنگ کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملا اور انھوں نے نواب صاحب کے زیر نگرانی ۱۸۹۶ء میں "افسر" کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا، جو چند سال تک جاری رہا۔ غرض کہ ان کے حیدرآباد پہنچنے کے بعد ہر نئے دن کا آفتاب جو طلوع ہوتا تھا وہ ان کے لئے نئی کامیابی اور نئی کامرانی کا پیام لاتا تھا۔ اس طرح رفتہ رفتہ ریاست کے با اقتدار طبقے یا سب ہی سے ان کے تعلقات قائم ہو گئے اور چونکہ انھوں نے معلّمی کا پیشہ اختیار کیا تھا اور برسوں بحیثیت ہیڈ ماسٹر، پرنسپل اور صدر شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ یہی پیشہ کرتے رہے اور محکمۂ تعلیم میں صدر مہتمم تعلیمات بھی رہے۔ اس لئے ریاست کے تعلیم یافتہ طبقے میں ان کے شاگردوں اور جاننے پہچاننے والوں کا ایک بہت بڑا حلقہ قائم ہو گیا۔ ریاست حیدرآباد میں سفارشیں حاصل کرنے کے لئے اہلِ غرض انھیں گھیرے رہتے تھے۔ حیدرآباد میں پانسو راجہ و نواب موجود تھے۔ ہر راجہ اور نواب کے ساتھ مصاحبوں کا بھی ایک گروہ ہوتا تھا جن کا کام

محض اپنے آقاؤں کی ہاں میں ہاں ملانا اور اپنا اُلّو سیدھا کرنے کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ راجے نوابوں کی اس معاشرت کا اثر ریاست کے دوسرے لوگوں پر بھی پڑا تھا۔ چناں چہ ہر با اقتدار آدمی کے ساتھ اس کی حیثیت کے مطابق چند مصاحب مقرر ہوتے تھے جو اس کے مزاج داں ہوا کرتے تھے۔ جس دور میں ریاست حیدرآباد گیا اس زمانے میں مولوی عبدالحق کا اقتدار انتہائی عروج پر تھا۔ بڑے بڑے حاکموں اور وزیروں کے عزل و نصب میں ان کا ہاتھ ہوتا تھا۔ ہر شخص خواہ انھیں پسند کرتا ہو یا نہ پسند کرتا ہو اُن سے دبتا ضرور تھا۔ پھر بھارتیہ ساہتیہ پریشد" کے ناگ پور والے اجلاس کے بعد اُردو دنیا نے مستقل طور پر انھیں اردو تحریک کا رہنما مان لیا تھا۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں مولوی صاحب کے ارد گرد مصاحبوں کا حلقہ کم ہونے کے بجائے اور زیادہ بڑھ گیا تھا۔ اور اب چوں کہ مولوی صاحب کی مصروفیات بھی روز بروز بڑھتی چلی جا رہی تھیں اس لئے یہ بغیر سوچے سمجھے اپنے مصاحبوں کے مشوروں پر عمل کرنے لگے تھے۔ حالاں کہ ان مصاحبوں کو نہ تو مولوی عبدالحق کی ذات سے کوئی دل چسپی تھی اور نہ انھیں انجمن ترقی اردو سے کوئی لگاؤ تھا۔ کوئی یہ سمجھتا تھا کہ مولوی صاحب کے بعد میں ان کے ذاتی ساز و سامان کا مالک ہوں گا اور کسی کے سر میں یہ سودا سمایا ہوا تھا کہ چونکہ انجمن کی روح رواں مولوی صاحب کی ذاتِ اقدس ہے، اس لئے مولوی صاحب کی وفات کے بعد انجمن میں ان کی جانشینی کا تاج میرے سر پر رکھا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ یہ سب انتہائی خود غرض اور مطلب پرست لوگ تھے! ان سب کی غرض صرف اتنی تھی کہ جس طرح بھی بن پڑے مولوی صاحب سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا لیا جائے۔ ریاست حیدرآباد کے طویل قیام اور با اقتدار حیثیت حاصل کر لینے کی وجہ سے خود مولوی صاحب کی طبیعت میں خوشامد پسندی آ گئی تھی، اور چونکہ وہ طبعاً نہایت آزاد آدمی تھے اور ریاستی ماحول میں جہاں آزادیٔ تحریر و تقریر کے علاوہ آزادیٔ اجتماع کا نام و نشان مٹ گیا تھا۔ اُن کی عمر کا ایک بڑا حصہ گزرا تھا اس لئے وہ سمجھتے تھے کہ کسی بھی مسئلے کے متعلق ان کی جو کچھ رائے ہے وہی صحیح ہے، باقی ہر بات غلط۔ اُن کی رائے سے اختلاف کرنے کا حق کسی کو بھی نہیں ہے۔ اُن کی طبیعت کے اس رنگ کا بہت معمولی باتوں میں بھی مظاہرہ ہوتا تھا۔ مثلاً ایک بار اورنگ آباد میں اُردو کے مشہور انشا پرداز نواب نصیر حسین خاں خیال کی انشا پردازی کا تذکرہ آ گیا۔ مولوی صاحب کہنے لگے "وہ ملا

محسوس ہوتا ہی تھا۔ سر اکبر حیدری کی صدارت عظمیٰ کے زمانے میں جب وہ حیدرآباد میں تھا، اُس وقت یہاں سیاسی جوڑ توڑ کرتا رہتا تھا! میں نے جواباً عرض کیا، ہو سکتا ہے کہ آپ کا یہ بیان درست ہو، مگر اس سے یہ کہاں ثابت ہوا کہ وہ اردو کے اچھے انشا پرداز نہ تھے۔ یہ سن کر مولوی صاحب ناراض ہو گئے۔ ایک مرتبہ انھوں نے مجھے ہدایت کی کہ میں ریاست کے ایسے شعرا کی ایک فہرست مرتب کر دوں جنھیں جامعۂ عثمانیہ کے سالانہ مشاعرے میں مدعو کیا جا سکے۔ میں نے فہرست تیار کر کے مولوی صاحب کے پاس بھجوا دی۔ تھوڑی دیر کے بعد ملازم فہرست واپس لے کر آیا، اس میں نیچے کی جانب لکھا ہوا تھا "فہرست مناسب ہے، اسے میرے کاغذات میں سنبھال کر رکھ دیجئے"۔ اب جو میں نے فہرست کو غور سے دیکھا تو اس میں لال پنسل سے مرزا یاس یگانہ کا نام کٹا ہوا تھا۔ میں فہرست لے کر مولوی صاحب کے کمرے میں گیا اور ان سے کہا کہ اس فہرست میں شاید مرزا یاس یگانہ کا نام غلطی سے کٹ گیا ہے۔ یہ سن کر انھوں نے فرمایا: نہیں یہ نام میں نے کاٹا ہے۔ اس پر میں نے ان سے کہا کہ مرزا کا اس وقت مسلم الثبوت اردو شعرا میں شمار ہے۔ یہ سن کر مولوی صاحب نے فرمایا یہ شخص غالب کو گالیاں دیتا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ مرزا یاس کو غلط نقاد یا تنقید نگار سمجھنا تو صحیح ہو سکتا ہے لیکن اس سے یہ کہاں ثابت ہوا کہ وہ اچھے شاعر نہیں ہیں۔ مگر مولوی صاحب مرزا کو مشاعرے میں مدعو کرنے پر کسی طرح راضی نہ ہوئے۔ عظمت اللہ خاں اردو شاعری میں پہلے آدمی تھے جنھوں نے ہندی شاعری کے عاشقانہ مضامین سے اردو شاعری کو روشناس کرایا اور ہندی پنگل کی بعض بحروں کے اردو میں کامیاب تجربے کئے۔ ان کی نظمیں زیادہ تر رسالہ اُردو میں شائع ہوئیں مگر خدا جانے بعد میں ان کے اور مولوی صاحب کے بیچ میں کیا معاملہ پیش آیا کہ ان کی وفات کے بعد مولوی صاحب کو ان کا کلام انجمن کی جانب سے شائع کرنے پر کبھی آمادہ نہیں کیا جا سکا۔ دکھنی اردو کی تحقیق میں سید شمس اللہ قادری مولوی صاحب کے ہم عصر تھے۔ مجھ سے بھی ان سے ملاقات تھی۔ ایک زمانے میں ان سے اور مولوی صاحب سے خوب چھنتی تھی مگر آئندہ چل کر ان کی صورت سے بے زار ہو گئے تھے۔ اردو کے مشہور مزاحیہ نگار فرحت اللہ بیگ بڑے مرنجاں مرنج اور باغ و بہار آدمی تھے۔ ان کے کئی مضامین رسالہ اردو میں شائع ہو کر ہر طرف مقبول ہوئے۔ مگر کچھ عرصے بعد مولوی صاحب اُن سے ناراض ہو گئے اور اس کے بعد پھر کبھی ان کا نام

سیفے کے بھی روادار نہ تھے۔ قاضی عبدالغفار مصنف "لیلیٰ کے خطوط" اور مولانا ابوالکلام آزاد سے ان کی ناراضگی کی وجہ سمجھ میں نہ آئی۔ مجھے اچھی طرح علم و اطلاع ہے کہ مولانا آزاد نے انجمن کا ڈائرکٹر بننے کی بھی خواہش نہیں کی تھی۔ مولوی صاحب نے خود انجمن کے مفاد میں مولانا سے درخواست کر کے ان کا نام مجلس نظما میں دیا تھا۔ مولانا آزاد کے مولوی صاحب سے کسی قسم کے ذاتی تعلقات نہیں تھے۔ لیکن جب مولوی صاحب انجمن لے کر دلّی چلے گئے اور جب بھی انھوں نے مولانا آزاد سے انجمن کے لئے کسی قسم کی مدد چاہی تو مولانا نے انجمن کی فی سبیل اللہ مدد کی اور تقسیم ہند کے بعد دلّی کے ہنگامے میں انجمن کا جو سرمایہ بھی بچ گیا وہ محض مولانا آزاد کی ذاتی کوشش اور شرافتِ نفسی کا نتیجہ تھا۔ مولوی صاحب نے جب دلّی کا ہنگامہ فرو ہونے کے بعد مولانا کے مکان پر قیام کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تو مولانا نے نہایت خندہ پیشانی سے مولوی صاحب کو دلّی بُلا کر اپنے مکان پر ٹھہرایا۔

اسی طرح سب کو معلوم ہے کہ شبلیؔ نعمانی کو تو مولوی صاحب نے کبھی معاف ہی نہیں کیا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ۱۹۳۳ء سے ۱۹۳۷ء کے وسط تک مولوی صاحب نے اردو کی توسیع و اشاعت کے لئے جو کام کیا وہ اس زمانے کے لحاظ سے سرسید کے کام سے ملتا جلتا کام تھا لیکن افسوس کہ مولوی صاحب ایک ایسے سرسید تھے جو محسن الملک، وقار الملک، سمیع اللہ خاں جسٹس کرامت حسین اور مولوی چراغ علی اعظم یار جنگ جیسا ایک بھی رفیق نہ بنا سکا۔ سرسید کا ایم اے او کالج ایک ایسا ادارہ تھا جس میں تعلیم پا کر محمد علی، شوکت علی ظفر علی خاں، ضیاالدین، حسرت موہانی اور عبدالحق جیسے لوگ پیدا ہوئے جنھوں نے زندگی کے مختلف شعبوں میں بڑا کام کیا اور بڑا نام پایا۔ لیکن انجمن ترقی اردو ایک ایسی انجمن تھی جو اردو کا ایک بھی ایسا اہلِ قلم پیدا نہ کر سکی جو اردو ادب کے کسی شعبے میں نمایاں مقام بناتا۔ ایسا نہیں ہے کہ انجمن میں ذہین و طباع اور غیر معمولی صلاحیتوں کے لوگ نہیں آئے۔ آئے اور ضرور آئے لیکن کچھ لوگ تو مولوی صاحب کی طبیعت کے تلوّن اور تیزی و تندی سے انجمن سے اکتا کر چلے گئے، کچھ لوگ مولوی صاحب کے مصاحبوں کی سازشوں کے شکار ہوئے اور کچھ کو مولوی صاحب نے خود علٰحدہ کر دیا۔ چناں چہ آخر میں نتیجہ یہ نکلا کہ انجمن ترقی اردو کا محض نام ہی نام رہ گیا اور مولوی صاحب

ذات بجائے خود انجمن بن گئی۔

"اسٹینڈرڈ انگلش اردو ڈکشنری" کی طباعت کا کام میری نگرانی اور میرے اہتمام
اورنگ آباد میں پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ میں نے اس موقع پر ان سے کہا کہ ایک صفحے پر ان تمام
ان کے نام اُن کے کاموں کی تفصیلات کے ساتھ شائع کر دیے جائیں جنھوں نے اس
ڈکشنری کے لیے الفاظ اور اصطلاحات بنانے اور مناسب الفاظ، ضرب الامثال اور
محاورات تلاش کرنے میں دن رات ایک کر دیے ہیں۔ اس پر مولوی صاحب نے فرمایا کہ پہلے
سے ڈکشنری کی اشاعت میں خلافِ توقع بہت دیر ہو گئی ہے۔ اب اگر ان لوگوں کے ناموں
اور کاموں کی تفصیلات شائع کی جائیں اور پھر انھیں چھاپا جائے تو اشاعت میں مزید تاخیر
ہو جائے گی۔ فی الحال اس کی گنجائش نہیں۔ یقین ہے کہ ڈکشنری بہت جلد بک جائے گی اور
اس کے بعد دوسرے ایڈیشن میں ساری تفصیلات شامل کر دی جائیں گی۔ مگر اب تک اس ڈکشنری
کے دوسرے ایڈیشن کی نوبت نہیں آئی، حالانکہ یہ کام پہلے ایڈیشن میں ہی نہایت آسان تھا۔
اس وقت انجمن ترقی اردو ہند کا صدر دفتر اورنگ آباد میں تھا۔ انجمن کے سارے رجسٹر اور ضروری
کاغذات وہیں موجود تھے اور یہ تفصیلات صرف ایک گھنٹے میں نکالی جا سکتی تھیں اور فقط
ایک صفحے پر نہایت آسانی سے ایک دن میں چھاپی جا سکتی تھیں۔ اس ڈکشنری کا اختصار ــــ
"اسٹوڈنٹس انگلش اردو ڈکشنری" کے نام سے وہیں اورنگ آباد میں میری نگرانی میں میرے
اہتمام سے شائع ہوا تھا۔ یہ ڈکشنری مذکورۂ بالا "سٹینڈرڈ انگلش اردو ڈکشنری" سے
مختصر کر کے مولوی صاحب کی ہدایت کے بموجب مرتب کی گئی تھی۔ مولوی صاحب نے اس پر
نظرِ ثانی کی تھی اور کہیں کہیں خفیف سی تبدیلیاں کی تھیں۔ مگر انھوں نے نہ جانے کیوں
اس ڈکشنری کے ٹائٹل پر اصل مرتب کا نام دینا پسند نہ فرمایا اور نہ اس حقیقت کا دیباچے
میں کوئی اعتراف کیا۔ ممکن ہے کہ ان سے یہ سہواً اپنے کسی مصاحب کے بہکانے کی وجہ سے
سرزد ہوا ہو۔ اس ڈکشنری کا ایک ایڈیشن پاکستان سے بھی شائع ہو چکا ہے اور اس میں بھی
یہ اسی طرح موجود ہے۔ علاوہ بریں اگر مولوی صاحب کی مصلحت کا تقاضا ہوتا تو کبھی
...ایک آدمی کا مسودہ دوسرے کے نام سے بھی شائع کرا دیا کرتے تھے چونکہ انجمن ترقی اردو ہند

کا دفتر دلّی کے ہنگامے میں لوٹ مار کی نذر ہو گیا اور انجمن ترقی اردو پاکستان بالکل جدید ادارہ ہے جو بالکل نئے خطوط پر پاکستان آنے کے بعد مولوی صاحب نے قائم کیا تھا اور اس ادارے کا کسی لحاظ سے بھی انجمن ترقی اُردو (ہند) سے کوئی تعلق نہیں، اس لئے سمجھ میں نہیں آتا کہ اب، جب کہ مولوی صاحب کا انتقال ہو چکا ہے، ان فروگذاشتوں کا ازالہ کون کرے گا؟

بہرکیف جب میں مولوی صاحب کی اُن خامیوں کو جن میں سے چند کا تذکرہ بیان کیا ہے ایک طرف رکھتا ہوں اور دوسری طرف ان کی رنگا رنگ شخصیت کا تصور باندھتا ہوں اور اُس کام کی طرف نظر کرتا ہوں جو انھوں نے اپنے رفیقوں کی مدد سے اردو زبان کی توسیع و اشاعت کے لئے کیا اور بطورِ خود جو علمی کام کیا، تو مجھے ان کی دل کش شخصیت اور ان کا کام، ان کی کمزوریوں اور خامیوں سے کہیں زیادہ وزن دار معلوم ہوتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اردو زبان کی تاریخ میں ان کا نام ہمیشہ عزت سے لیا جائے گا فقط!!

(بہ شکریہ ادبی دنیا)[1]

---

[1] ادبی دنیا (لاہور) ۔ خاص نمبر۔ دور پنجم شمارہ ششم
مظفر حسین صاحب شمیم کے اس مقالے کے بعض حصے طوالت کی وجہ حذف کر دئے گئے ہیں۔

رفیع اللہ عنایتی
ایم۔اے (علیگ)

باتیں کرنے کا فن

لوگ باتیں کرتے ہیں بعض کم اور بعض زیادہ۔ ان میں پڑھے لکھے اور غیر پڑھے لکھے سب ہی قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ پھر ان میں مختلف فنوں کے ماہر بھی ہوتے ہیں۔ عالموں میں بھی سب ایک سے نہیں ہوتے۔ کچھ محض اسکالر ہوتے ہیں لیکن زندگی کا تجربہ نہیں رکھتے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ جو زندگی کا تجربہ رکھتے ہیں وہ عالم نہیں ہوتے لیکن گفتگو سب کرتے ہیں۔ کچھ میں یہ خداداد صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ اپنی باتوں سے دوسروں کو متاثر کر سکیں۔ ایسے اشخاص لوگوں کی نفسیات کے ماہر ہوتے ہیں۔

باتیں کرنے کا فن انتہائی مشکل فن ہے۔ باتیں کرنے والے کی شخصیت متوازن ہونی چاہئے وہ لوگوں کے مختلف النوع مزاجوں سے بخوبی واقف ہو۔ موقعہ اور محل کی مناسبت سے باتیں کرنے کا عادی ہو۔ گلی کوچوں میں اپنے علم کا مظاہرہ نہ کرتا ہو۔ الفاظ، افکار اور علم کو وقت کی مناسبت سے برتے۔ پڑھے لکھوں میں پڑھے لکھوں کی سی اور کم علموں میں کم علموں کی سی باتیں کرے شخصیت میں سوز اور توازن ہونا لازمی ہے۔ اگر اس کے دل میں انسانیت کا درد ہے تو وہ اپنی باتوں سے دوسروں کو جلد متاثر کر سکتا ہے۔ اس کے لب و لہجہ میں ایک مقناطیسی قوت ہوتی ہے جو ہر شخص کو اپنی طرف کھینچنے کی جاذبیت رکھتی ہے لیکن یہ سوز عشق کی آگ میں تپا ہو۔ انسانیت سے ہماری بڑی دولت ہے۔ لوگ باتیں کرنے والے کو پہچان جاتے ہیں کہ وہ کس قسم کا انسان ہے ہوشیاری اور تدبیر انسانوں کے فائدے کے لئے چننا چاہئے نہ کہ ان کو بیوقوف بنانے کے لئے کچھ دن تو لوگ بیوقوف بن سکتے ہیں لیکن ہمیشہ نہیں۔ موقع اور محل میں بھی مفاد عامہ کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ اگر لوگ غلط راہ پر لگے ہوئے ہیں اور اپنے مفاد تک کو نہیں جانتے تو باتیں کرنے والا ان کے دل میں

صحیح

یہ جتائے کہ اس چیز میں تمھارا فائدہ ہے اور اس میں نقصان لیکن تربیت کی ضرورت ہے۔ اگر تربیت
اچھی ہے۔ علم منجھا ہوا ہے، شخصیت ہیرے کی طرح ترشی ہوئی ہے تو پھر گفتگو کرنے والا کامیاب ہوگا۔ لیک
چائے کی پارٹیوں، نجی جلسوں، سیاسی مجلسوں، علمی مباحثوں میں گفتگو کرتے ہیں۔ ہر ایک محل کی باتیں
ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں۔ جن لوگوں کو پوری طرح علم مجلسی آتا ہے وہ گفتگو میں کامیاب ہوتے
ہیں۔ ہر محل کی باتیں ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں۔ خالی کتابوں کا پڑھ لینا کوئی بڑی بات نہیں۔ گدھے
پر کتابیں لاد دینے سے کوئی عالم نہیں ہو جاتا۔ جب تک علم پوری طرح ہضم نہ ہو۔ پھر گفتگو کرنے والے کو
اس زبان میں مہارتِ کلی نصیب ہو جس کو اس نے ذریعۂ اظہار بنایا ہے وہ عوام و خواص کی روزمرہ کی
زبان سے کما حقہ واقف ہو، ان کے روزمرہ اور محاورات کو بخوبی جانتا ہو لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں
کہ وہ ماہر لسانیات بھی ہو۔ ہاں اگر وہ ماہر لسانیات ہے تو سبحان اللہ گفتگو صاف، سادہ اور جامع ہو
اور اس میں کسی قسم کی الجھن نہ ہو۔ وہ بے داغ مغزی کی عکاس ہو۔ روشن دماغی کی آئینہ دار ہو۔

کچھ لوگ ایک بات کو مختصر بیان کرنے کے عادی ہوتے ہیں اور کچھ اسی بات کو طول دیتے ہیں۔
تجربہ نے بتایا ہے کہ اگر گفتگو سادہ اور جامع ہو تو بہتر ہے مفہوم کو پوری طرح واضح ہونا ضروری ہے
رفیع احمد قدوائی مختصر گفتگو کرنے کے عادی تھے لیکن ان کی گفتگو ان کے انتھک اور ٹھوس کام کی آئینہ
ہوتی تھی۔ ہندو اور مسلمان چھوٹے اور بڑے سب یہ جانتے تھے کہ رفیع صاحب مخلص ہیں۔ ان کے ہر کام میں
محنت ہوتی ہے۔ ان کی گفتگو کا اثر لوگوں کے دلوں پر ہوتا تھا۔ ان کی باتیں لوگوں کے دلوں میں گھر کر لیتی
تھیں۔ مولانا ابو الکلام آزاد کی باتوں میں علمیت ہوتی تھی، وزن اور وقار ہوتا تھا۔ اس بات سے
کون ایسا شخص ہے جو انکار کر سکتا ہے۔ ان کے ساتھی یہ بھی جانتے تھے کہ وہ مشکل سے مشکل مسئلے کو بڑی صفائی
کے ساتھ حل کر دیتے ہیں۔ کوئی بات الجھی ہوئی نہیں ہوتی۔ ان کی باتوں میں ذہانت بھی ہوتی تھی لیکن مولانا
عوام کی نفسیات کو کم جانتے تھے۔ ان کی "انانیت" نے ان کو عوام کو سمجھنے سے باز رکھا۔ یہ بات بھی صحیح
معلوم ہوتی تھی۔ وہ کم باتیں کرتے تھے بلکہ اس میں وقت کی ضروریات کا لحاظ ہوتا تھا۔ وہ لوگوں کے نفس
شناس اور مزاج شناس تھے۔ ان کی باتیں صاف ہوتی تھیں۔ ان میں کسی قسم کی جھجک نہیں ہوتی تھی۔ ہاں
مہاتما گاندھی کی باتوں میں پیچ و خم ہوتا تھا۔ ان میں الجھاؤ اور ہیر پھیر ہوتا تھا۔ وہ عموماً ذو معنی باتیں
کرنے کے عادی تھے۔ ملک کی تقسیم کا بڑا سبب ان کی باتوں کی پیچیدگی تھی۔ بڑے بڑے دماغ ان کی

باتوں میں الجھ جاتے تھے۔ اس کی یہ وجہ ہرگز نہیں تھی کہ ان کو زندگی کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ یہ بات بھی نہیں ہے کہ وہ ذہین نہیں تھے۔ وہ مانے ہوئے دانش مند تھے لیکن ہاں ان کا مزاج ہی کچھ اس قسم کا تھا۔ پنڈت جواہر لال بھی مسائل کو الجھانے کی کوشش کرتے ہیں اور گفتگو میں اردو سے کام لیتے ہیں جان بوجھ کر وہ اس قسم کا طرز اختیار کرتے ہیں۔ ان کی اس قسم کی گفتگو نے تاریخ میں بڑے کھیل بگاڑے ہیں جب لیگ نے کیبنٹ مشن پلان کو نامنظور کر دیا، اور وہ کانگریس کے صدر ہوئے تو ایسی تقریر کی جس سے جناح کو دوسرا لیگ کا اجلاس طلب کرنا پڑا اور مشن کی اسکیم کو رد کرنا پڑا۔ وہ انتہائی جذباتی ہیں، شدت پسند ہیں لیکن خلوص کی کوئی کمی نہیں محنتی بھی کافی ہیں۔ اسی محنت اور خلوص نے ان کو کامیاب بنایا ہے لیکن باتیں الجھی ہی کرتے ہیں۔ ڈاکٹر ذاکر حسین باتیں کرنے کے فن میں ماہر ہیں۔ ان کی گفتگو میں دیانت، تجربہ کی تپش اور علم کی چاشنی ملتی ہے۔ ان کے دل میں انسانیت کا بے انتہا درد ہے اور ایک ایسی بات ان میں ملتی ہے جو کسی دوسرے میں نہیں پائی جاتی اور وہ یہ کہ وہ اپنی باتوں سے مختلف اور متضاد عناصر کو یکجا کر سکتے ہیں۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی سلور جوبلی میں کانگریس کے رہنما بھی تھے اور لیگ کے بھی۔ انھوں نے ایسے نازک وقت میں متضاد عناصر کو جامعہ کی جوبلی میں یکجا کر دیا تھا جب یہ کام ناممکن نظر آتا تھا اور جو گفتگو انھوں نے جوبلی کے جلسے میں کی وہ ایک تاریخی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں بلا کا اثر تھا۔ ہر شخص رو رہا تھا ایک موسلا دھار بارش تھی جو لوگوں کی آنکھوں سے ہو رہی تھی۔ وہ اپنی ملاقاتوں میں بڑی پُر اثر گفتگو کرنے کے عادی ہیں۔ ہندوستان بھر میں ذاکر صاحب کے مقابلے کا باتیں کرنے والا کوئی دوسرا نہیں ہے۔ انگلینڈ، فرانس اور امریکہ کے لوگ بھی ان کا لوہا مانے ہوئے ہیں۔ وہ بے پناہ ذہنی ہیں۔ زبان پر استادانہ قدرت رکھتے ہیں۔ اردو الفاظ، محاورے اور فقرے تو ایسے استعمال کرتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ ان کی باتیں سحر انگیز ہوتی ہیں۔

گفتگو کرنے والا گفتگو میں exact ہو۔ جب وہ علمی مباحث اور موضوعات پر گفتگو کرے تو اس کا حق ادا کر دے۔ اور موضوع کا کوئی پہلو بھی تشنہ نہ رہ جائے تحقیق کا بھی پورا حق ادا کر دے۔ اس موضوع پر جس قدر بھی لٹریچر ہو وہ نظر سے گذر چکا ہو اور اس کے جاندار اور صحت مند عناصر بھی محفوظ ہوں۔ وہ چمن سے کلیوں کو چننے اور ساگر سے موتیوں کے رولنے کا فن جانتا ہو۔ گفتگو میں مکمل طور پر غیر جانب دار ہو۔ کسی جماعت یا نظریہ سے متاثر نہ ہو۔ جو لوگ

ایسا کرتے ہیں ان کی باتوں میں پائیداری نہیں ہوتی۔ ایمان داری اور غیر جانب داری کا
دامن کبھی ہاتھ سے نہ جانے دے۔ ہمیں ایسے بھی اسکالر ملتے ہیں جنھوں نے حقائق کو ذاتی یا قومی
مفاد کے مدنظر پیش کیا ہے۔ حقائق کو پیش کرنے میں کسی مصلحت کا خیال نہ ہو بلکہ علمی نقطۂ
نگاہ ہو۔ اور یہ خیال رہے کہ یہ بات آیندہ نسلوں کے کانوں تک پہنچتی ہے۔ ان میں ہمیشگی اور
دوام ملحوظ ہو لیکن ایسے دماغ گنے چنے ہوتے ہیں۔ وہ عام سطح سے بلند ہوتے ہیں۔ وقت کے
تقاضوں سے باخبر ہوتے ہیں۔ ان کے اندر وہ بصیرت ہوتی ہے جو حقائق کو چھان بین کے ساتھ
پیش کرتی ہے۔ باتیں کرنے والے کو سماجی معلم ہونا چاہیئے۔ اجتہادی قوت کا ہونا ضروری ہے
دماغ ٹھنڈا ہو۔ جلد باز اور شدت پسند لوگ اپنی باتوں سے کھیل بگاڑ دیتے ہیں۔ اعتدال
توازن اور اعلیٰ سنجیدگی کا ہونا ضروری ہے۔ باتوں میں افسردگی اور اضمحلال کا ہونا مفید
نہیں۔ ان میں توانائی اور طاقت ہو۔ طاقت کا ہونا لازمی ہے۔ گیلی لکڑی کا سا دھواں
اور آگ کی تپش نہ ہو بلکہ دھیما پن اور بے دار مغزی ہو۔ وسیع النظری اور روشن خیالی
ہو۔ دلیری اور اولوالعزمی ہو۔ حوصلہ مندی اور فراست ہو۔ حق کو حق کہنے کی عادت ہو سچ کو سچ
اور جھوٹ کو جھوٹ کہنے کا ملکہ ہو۔ جو لوگ اس چیز میں مصلحت آمیزی سے کام لیتے ہیں وہ
ناکام رہتے ہیں۔ چاہے ان کو وقتی طور پر کامیابی نصیب ہو جائے لیکن دائمی اثر نہیں ہوتا۔ سر
سید احمد خاں میں بڑی جرأت تھی۔ حق کو حق کہنے کی عادت تھی۔ وہ حقیقت پسند بھی تھے۔
صاف اور ستھری گفتگو کرنے کے عادی تھے۔ لیکن بعض دفعہ وہ جذباتی ہو جاتے تھے علی گڑھ
کے ٹرسٹی بل پر انھوں نے سمیع اللہ خاں سے جھگڑا کیا جس کی وجہ سے ان کے سارے شرکائے کار
ان سے خفا ہو گئے تھے۔ حالی، شبلی، محسن الملک اور وقار الملک جو ان کے سرگرم ساتھی تھے انھوں نے
ان کی مخالفت کی۔ یہ عمر بھر سرسید کے ساتھ کام کر چکے تھے۔ ان کی مخالفت کا سبب بھی سرسید
کی شدت پسندی تھی۔ پروفیسر محمد حبیب ہندوستان کی عہد وسطیٰ کی اسلامی تاریخ کے بڑے عالم
ہیں وہ سیاسیات کے پروفیسر بھی رہ چکے ہیں۔ وہ بڑی دل چسپ باتیں کرتے ہیں۔ ان کی گفتگو میں
مزہ ہوتا ہے وہ اکثر باتیں کرتے کرتے افکار میں غرق ہو جاتے ہیں۔ ہر وقت فلسفیانہ استغراق کی
کیفیت طاری رہتی ہے۔ بڑے سادہ انداز میں گفتگو کرنے کے عادی ہیں جس موضوع پر گفتگو کرتے ہیں

اس کا حق ادا کر دیتے ہیں۔ اپنے بے پناہ علم کی مدد سے چیزوں کو پیش کرنے کے عادی ہیں۔ انگریزی، اردو، فارسی اور عربی زبانوں پر کافی عبور رکھتے ہیں۔ بھیانے باتوں کو شروع کرتے ہیں۔ گفتگو میں سوز و اثر ہوتا ہے۔ وہ صوفی المشرب ہیں۔ ہندوستان و ایران کے صوفیاء کی تخلیقات اور ان کی زندگیوں کا بخوبی مطالعہ کیا ہے۔ زندگی میں خدمت خلق بھی کافی کی ہے۔ اس لئے باتوں میں سحر انگیزی کی قوت ہے۔ بڑے مخلص ہیں۔ انسانوں سے ہمدردی رکھتے ہیں۔ ہندوستان کے طالب علم اور سارے پڑھے لکھے ان کو جانتے ہیں۔ دیگر ممالک میں بھی ان کی خاصی شہرت اور عزت ہے۔ مطالعہ برابر جاری ہے۔ ذرا ذرا سی باتوں کا علم رکھتے ہیں۔ وہ اپنی باتوں میں "اوریجنل" ہیں۔ چیزوں کو اپنے انداز سے پیش کرنے کے عادی ہیں۔ اشتراکیت اور اسلام کا مطالعہ بے انتہا ہے۔ اشتراکیت پر ہندوستان میں ان سے بڑا کوئی عالم نہیں ہے۔ دلچسپ، علمی اور فکر انگیز باتیں کرنے میں ان کو قدرت حاصل ہے۔

غلام السیدین کی باتوں میں نکھار ہوتا ہے۔ اس میں کھلا ہوا انداز خطابت حسن و خوب صورتی ملتی ہے علمیت ہوتی ہے۔ اعلیٰ سطح ہوتی ہے۔ اقبال کے اشعار بھی سنائے جاتے ہیں۔ اکثر و بیشتر ان کے یہاں حکیمانہ انداز ملتا ہے۔ ذاکر حسین سے متاثر نظر آتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ ان کے مرشد ہیں۔ علی گڑھ میں بھی اور باقی زندگی میں بھی۔ ہر جگہ ذاکر حسین کی فکر کی چھاپ ملتی ہے۔

مولانا محمد علی مرحوم کی باتوں کی بھی بڑی شہرت ہے۔ وہ بڑی تیزی کے ساتھ گفتگو کرنے کے عادی تھے۔ زندگی کا تجربہ تھا۔ مرد مومن تھے۔ اپنے زمانہ کے بڑے لیڈر تھے۔ انگریزی پر حاکمانہ قدرت رکھتے تھے۔ نکھری ہوئی باتیں کرنے کے عادی تھے۔ جذباتی اور شدت پسند تھے۔ چیزوں کے بارے میں جلد فیصلہ کر لیتے تھے۔ مذہب کے غلبہ نے ان کو ناکام بنایا۔ جذبات کی رو میں ۱۹۲۱ء میں مولانا نے گاندھی جی کو جامع مسجد دہلی کے منبر پر بٹھا کر ان کو باپو کا خطاب دیا۔ جرأت آزاد فکر انسان تھے۔ باتوں میں بیباکی تھی۔ بہت ذہین تھے۔

دلوں کی پرائیوٹ گفتگو میں ان کی نجی زندگی کی ایک ایک بات آجاتی ہے۔ گھریلو جھگڑے اور سارے ناخوشگوار واقعات کا اظہار ہوجاتا ہے۔ بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو زندگی کے ان پہلوؤں کو چھپا جاتے ہیں۔ وہ بے حد سنجیدہ اور دانا ہوتے ہیں۔ یہ بڑی خوبی کی بات ہے یہ بات زندگی کے تجربے سے آتی ہے۔ زندگی میں مصائب برداشت کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ گھریلو زندگی کا کوئی پہلو بھی دوستوں یا غیروں سے گفتگو کرتے وقت ظاہر نہیں ہونا چاہیئے۔ بہت سے بڑے آدمی اس لئے سازش کا شکار ہوگئے کہ ان کی اندرونی زندگی سے دشمن واقف ہوگئے تھے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ دوران گفتگو میں ان تمام پہلوؤں کو نظر انداز کر دیا جائے۔ باتیں کام کی کی جائیں۔ بکواس اچھی نہیں۔ اس لئے کہ کوئی اس سے خوش نہیں ہوتا۔ بکواس پر صرف بہرہ ہی خوش ہوسکتا ہے۔" ہندوستان کے سیاسی رہنماؤں میں صرف رفیع صاحب میں یہ خوبی تھی کہ وہ نجی زندگی کے چہرہ سے نقاب نہیں اٹھاتے تھے۔

بہت سے لوگوں کی باتوں سے ایسا پتہ چلتا ہے کہ وہ جیسے تقریر کر رہے ہیں۔ یہ بات خوبی نہیں بلکہ عیب میں داخل ہے۔ تقریر بھی وہ پُر اثر ہوتی ہے جس میں باتوں کا رنگ آجائے۔ مہاتما گاندھی کی تقریر بھی ایسی ہوتی تھی کہ جیسے کوئی گفتگو کر رہا ہے۔ ان کی اسی خوبی نے چالیس کروڑ ہندوستانیوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا اور اس "نیم ننگے" اور "نیم وحشی" ہندوستانی نے یہاں کی سیاست کو خوشامدی اور سطحی سیاست کے دائرہ سے نکال کر اس کو انقلابی رنگ عطا کیا تھا۔ ان کی اسی روش نے ہندوستان کو انگریزی سامراج سے آزاد کرایا۔ انھوں نے اچھوتوں کے درجہ کو بلند کرنے کی کوشش کی۔ اسی نے ان کو ہندوستان کی تاریخ کا سب سے بڑا انسان بنا دیا تھا۔ جواہر لال، راجندر پرشاد، سردار ولبھ بھائی پٹیل، مولانا آزاد، رفیع احمد قدوائی، ڈاکٹر ذاکر حسین سب ہی مہاتما گاندھی کی باتوں سے متاثر تھے۔ گفتگو کا یہی دھیما پن اور دریا کی سی روانی اپنا اثر کرتی ہے۔

دیلی شیف اور ماسلوف

سوویٹ یونین میں ہندوستانی ادبیات کا مطالعہ

(۱)

سوویٹ یونین کے ماہرین ہندیات نے گذشتہ سال ہندوستان کی زبان، تاریخ، ادب
پر بعض قابل ذکر کتابیں لکھی ہیں۔

جو قابل ذکر کتابیں شائع ہوئی ہیں ان میں "ہندوستان کی نئی تاریخ" ہے۔ اسے انتونوف،
وُلدبرگ اور اوسیپوف نے ترتیب دیا ہے۔ دوسری کتاب "ہندوستان میں جاگیروں کا خاتمہ"
ہے جسے دیویا تکنیا نے لکھا ہے۔ "جدید ہندوستان میں نقل و حمل" بیسیالوف کی تصنیف ہے
برشونے نے "تیل" اقتصادی آزادی کے لئے ہندوستان کی جد وجہد"۔ ہندوستان کی قدیم تاریخ کے
بارے میں بھی کچھ مورخین ایک کتاب کی تالیف کر رہے ہیں۔

ہندوستانی زبانوں کے شعبے میں ماہرین لسانیات برابر کام کر رہے ہیں۔ سردیوک منکو کی ادارت
میں ہندوستان کی بعض زبانوں کی قواعد پر مضامین کا ایک مجموعہ شائع ہوا ہے۔ سنسکرت، ہندی، پنجابی،
تامل، تلیگو، ملیالم، آسامی اور بعض دوسری زبانوں کی قواعد پر اس مجموعے میں مضامین شامل ہیں۔
یہ مضامین ہندوستانی ماہروں نے تحریر کئے ہیں۔ یہ کتاب اعلیٰ تعلیمی اداروں کے طلبہ کے لئے جو
ہندوستانی زبانوں کا مطالعہ کر رہے ہیں بہت مفید ثابت ہوگی۔

گزشتہ دنوں پنجابی، روسی لغت شائع ہوا ہے۔ اسے رانبوویچ اور سربریا کوف نے مرتب کیا
ہے۔ اس لغت کی بدولت پنجابی سے روسی زبان میں ترجمہ کرنے میں بڑی مدد ملے گی۔ طلبہ بھی اس
لغت سے فائدہ اٹھائیں گے۔

سوویٹ یونین کے بعض ماہرین ہندیات ادبی مسائل پر بھی کام کر رہے ہیں۔ جلد ہی دو
کتابیں شائع ہونے والی ہیں۔ دونوں میں نوجوان تنقید نگاروں کے مضامین ہیں۔ ایک کتاب

"ہندوستانی نثر کے مسائل" اور دوسری کتاب "ہندوستانی نظم کے مسائل" کے نام سے شائع ہونے والی ہے۔ ان کتابوں میں نظیر اکبرآبادی، منشی پریم چند، رابندرناتھ ٹیگور، درمداون لال ورما، سومترا نندن پنت، بھانیشور ناتھ رینو اور تامل، تیلگو اور ملیالم کے بعض ممتاز ادیبوں پر تنقیدی مضامین ہیں۔

سوویٹ یونین میں ہندوستانی ادب سے لوگوں کی دلچسپی بڑھتی جا رہی ہے۔ اب تک تین سو سے زیادہ کتابیں نکل چکی ہیں جن کی مجموعی اشاعت ڈیڑھ کروڑ کاپیوں سے بھی زیادہ ہے۔ قدرتی امر ہے کہ لوگ ادبی تنقید اور تاریخ کی بھی ضرورت محسوس کر رہے ہیں تاکہ وہ ادبی روایات اور سماجی پس منظر سے بھی واقفیت حاصل کریں۔ چنانچہ ہندی، اردو، پنجابی، بنگالی اور دوسری زبانوں کے ادب پر سوویٹ محققین تنقیدی مقالے تیار کر رہے ہیں جو اس سال سے شائع ہونے لگیں گے۔

نیپالی زبان کا ایک لغت قریب قریب مکمل ہو چکا ہے اور مشہور عالم نکولائی رورِخ نے سنسکرت، تبتی اور انگریزی سے روسی کا جو لغت شروع کیا تھا اسے مکمل کرنے کے لئے رورِخ کے کئی شاگرد کام کر رہے ہیں۔ ہندی روسی کا ایک بڑا لغت (ایک لاکھ الفاظ کا) بسکروفنی کی ادارت میں زیر ترتیب ہے ۱۹۶۵ء میں شایع ہوگا۔

مشہور و معروف ماہر علم الہند اکاڈمی شین برانیکوف کی تصنیفات کے انتخاب کی دوسری جلد ۱۹۶۲ء میں شایع ہوگی۔ پہلی جلد جس میں ہندوستانی زبانوں کا مطالعہ ہے ۱۹۶۱ء میں شائع ہو چکی ہے۔

قدیم تہذیب و تاریخ

سوویٹ ماہرین پرانے علماء کی روایات پر چل کر ہندوستان کی قدیم تہذیب اور تاریخ کا مطالعہ بھی کر رہے ہیں۔ تامل زبان کے ادب العالیہ کا ایک شہ پارہ 'کورال' روسی زبان میں ترجمہ ہو کر اس سال شائع ہو جائے گا۔ مہابھارت کے دوسرے اور تیسرے ٹکڑے کا ترجمہ بھی روسی زبان میں تیار ہو رہا ہے۔ سنسکرت کے عالم رگ وید کے مطالعہ میں مصروف ہیں اور اس کے ترجمے کی تیاری بھی ہو رہی ہے۔ بھرتری ہری کی مشہور تصنیف "شتکا" کا ترجمہ بھی ہو رہا ہے۔

کئی محققین مشترکہ طور پر "ہندوستان کی قدیم تاریخ" کے عنوان سے ایک طویل مقالہ ترتیب دے رہے ہیں۔

ہندوستانی ادب اور تاریخ اور ہندوستانی زبانوں کے مطالعہ میں سوویٹ یونین کے
محققین ہندوستانی عالموں سے مثلاً سونیتی کمار چٹرجی، گوپال ہلدر، ہیرین مکرجی وغیرہ سے
بھی مدد حاصل کرتے ہیں۔

(چیلی شیف)

(۲)

ہندوستان کی مختلف زبانوں کا سوویٹ یونین میں بڑے پیمانے پر مطالعہ ہو رہا ہے۔ بہت
سے ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کے اداروں میں ہندوستانی زبانیں پڑھائی جاتی ہیں۔ مطالعہ اور تحقیق کے
شعبوں میں لسانیات کے مختلف صیغوں کا مثلاً صوتیات یا حروف کی آواز، صوتیات یا الفاظ کی
ساخت اور نحو یا جملوں کی ترتیب اور ساخت کا مطالعہ ہو رہا ہے اور بدیسی زبانوں کے اشاعت گھر
لغات، درسی کتابیں اور تعلیمی کتابچے شایع کر رہے ہیں۔

ماسکو میں بین الاقوامی تعلیمات کا انسٹی ٹیوٹ غیر ملکی زبانوں کی تعلیم کا سب سے بڑا ادارہ
ہے یہاں طلبہ مقابلے کے امتحان سے گذر کر داخل ہوتے ہیں۔ زبان و ادب سے دلچسپی رکھنے والے
نوجوانوں کی بڑی تمنا ہوتی ہے کہ وہ اس انسٹی ٹیوٹ میں داخلہ لیں۔ ہندوستانی زبانوں کے شعبے
خاص طور پر مقبول ہیں۔

انسٹی ٹیوٹ میں ہندوستانی زبانوں کے مشترکہ شعبے کے صدر پروفیسر چیلی شیف اور
اساتذہ میں گلیبڈ لیشیوا، پوشتس، وادی دودا، لادر نیکو، ناتیوک ڈانیلچوک اور دوسرے
معلمین ہیں۔ جو ہندوستان کی مختلف زبانوں کی تعلیم دیتے ہیں۔ ابھی تک اس انسٹی ٹیوٹ میں
صرف تین زبانوں کی یعنی ہندی، اردو اور بنگالی کی باقاعدہ تعلیم دی جا رہی ہے۔ جلد ہی مراٹھی
کی تعلیم بھی شروع ہوگی۔

ماسکو یونیورسٹی سے ملحق مشرقی زبانوں کے انسٹی ٹیوٹ میں جو کہ ۱۹۵۶ء میں قائم ہوا تھا
ہندی، اردو اور بنگالی کے علاوہ سنسکرت کی بھی تعلیم دی جاتی ہے اور جلد ہی پنجابی اور تامل زبان
کے شعبے بھی کھل جائیں گے۔ لینن گراڈ اور تاشقند کی یونیورسٹیوں میں ہندی، اردو اور بنگالی، تامل،

پنجابی اور مراٹھی کی تعلیم دی جارہی ہے۔ ان تعلیمی اداروں کے علاوہ ماسکو لینن گراڈ اور تاشقند کے بہت سے ثانوی اسکولوں میں ہندوستانی زبانوں کی تعلیم دی جارہی ہے۔

سوویٹ یونین میں سائنسوں کی اکاڈمی کے تحت ایشیائی قوموں کے انسٹی ٹیوٹ میں ہندوستان کی مختلف زبانوں پر تحقیقی کام ہوتا ہے۔ اس وقت ہندیات کے ماہرین کا ایک گروپ، گجراتی، کنڑی، ملیالم، آسامی اور اُڑیا کا مطالعہ کررہا ہے اور جلد ہی دوسرے اداروں میں ان زبانوں کی تعلیم شروع ہوجائے گی۔ انسٹی ٹیوٹ کے کئی کارکن ہندوستانی زبانوں کے قواعد پر کام کررہے ہیں۔

گزشتہ پانچ چھ برس میں سوویٹ یونین کے بعض ماہروں نے زبان سے متعلق جو مقالے شایع کئے ہیں ان میں سے کچھ کے عنوانات یہ ہیں:

ہندوستان کی قدیم زبانوں میں افعال کی قسمیں۔

مراٹھی زبان کے الفاظ کی ساخت۔

اُنیسویں صدی کے آغاز میں اُردو نثر کی بعض بنیادی خصوصیات۔

جدید ادبی ہندی۔

ہندوستانی زبانوں کے مطالعے کی وسعت کا اندازہ اس سے بھی ہوسکتا ہے کہ ۱۹۵۲ تا ۱۹۶۱ء ہندی روسی لغت کی ۱۹۵۰۰۰ کاپیاں شائع ہوچکی ہیں۔

(ماسکو)

انجمن ترقی اردو شاخ دہلی
کا
خبرنامہ

یوم مسیح الملک حکیم اجمل خاں

۷ جنوری کی شام کو پنڈت سندر لال صاحب کی صدارت میں مسیح الملک حکیم اجمل خاں کی یاد میں انجمن ترقی اردو شاخ دلّی کی نشست ہوئی۔

پنڈت جی نے اپنی صدارتی تقریر میں فرمایا کہ میرے ان مسلمان دوستوں میں حکیم صاحب بھی شامل ہیں جو ہمیشہ مجھے یاد رہیں گے اور جن کی ذات گرامی میرے لئے مشعلِ راہ بنی حکیم صاحب کا شمار کانگریس کے ان لیڈروں میں ہے جنھوں نے اس کو زندگی بخشی۔ ۱۹۲۴ء میں جب پہلی مرتبہ ہندو مسلمانوں میں جھگڑے ہوئے اور گاندھی جی نے ۲۱ دن کا برت رکھا تو حکیم صاحب کی کوشش ہی سے ہندو مسلم اتحاد ہوا اور دلّی کی فضا خوش گوار ہوئی۔ میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ حکیم صاحب ان برگزیدہ ہستیوں میں تھے جن کے دل میں کبھی بھی کدورت نہیں آئی۔ ۱۹۲۴ء میں ان کے اکثر ہندو احباب بھی جب ان کو سمجھانے جاتے تو تلخ گفتگو کرتے لیکن حکیم صاحب ان طنزیہ باتوں کو ہنسی میں ٹال جاتے تھے اور بہکے ہوئے لوگوں کو راہ پر لے آتے تھے۔

گاندھی جی کو حکیم صاحب پر پورا اعتماد تھا۔ دلّی میں اگر حکیم صاحب اور ڈاکٹر انصاری نے کانگریس کا ساتھ نہ دیا ہوتا تو یہاں کام ہونا بہت مشکل تھا۔ طبیہ کالج میں بھی طب یونانی اور آیورویدک کی پڑھائی کا طریقہ ساتھ رکھ کر حکیم صاحب نے یہ چاہا تھا کہ اس طرح جو بھی طلبا یہاں سے پڑھ کر نکلیں یونانی اور ہندوستانی دونوں علاج کے ماہر ہوں۔ حکیم صاحب کی صفات بیان کرنے کے لئے وقت بھی درکار ہے اور قابلیت بھی۔ دلّی کی پرانی تہذیب و شائستگی کا وہ

مکمل نمونہ تھے۔"

مفتی عتیق الرحمٰن صاحب نے حکیم صاحب مرحوم کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ یہ وقت ایسا ہے کہ حکیم اجمل خاں جیسی بڑی ہستی کا تعارف بھی کرانا مشکل ہے کیونکہ ان کی اعلیٰ صفات کو سمجھنے کے لئے اس دور کے لوگوں میں ہمت نہیں ہے۔ مجھے یہ کہتے ہوئے بڑا افسوس ہوتا ہے کہ آزادی کی تاریخ میں کہیں بھی حکیم اجمل خاں کا نام نظر نہیں آتا حالانکہ کانگرس کی بنیاد کو جن لوگوں نے مضبوط کیا ان میں حکیم صاحب بھی شامل تھے۔ یہ بہت بڑی ناانصافی ہے۔ وہ ایسے ہی پائے کے لیڈر تھے جیسے گاندھی جی اور مولانا آزاد۔ ان کے کاموں کو یاد رکھنا گویا اپنی تاریخِ آزادی کو دہرانا ہے اور ان کی اعلیٰ صفات سے آج کل کے لوگوں کو سیکھنے کا بھی موقع ملتا۔ اس ملک کے بنانے میں۔ ان کا اتنا ہی حصہ ہے جتنا ان کے اور ساتھیوں کا تھا۔ ہندو مسلم ایکتا کا لفظ جو آج بار بار دہرایا جاتا ہے۔ اس دور میں نہیں تھا۔ تقسیم کے بعد مسلمانوں میں بے دلی آگئی ہے اور ان کی بات کا وزن چلا گیا ہے۔ حکیم اجمل خاں کے زمانہ میں ایسا نہیں تھا لیکن وہ سمجھتے تھے کہ ہندوستان کا مزاج ایسا ہے کہ یہاں کوئی بڑا کام ہندو مسلم اتحاد کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ اس لئے بغیر کسی وقتی مصلحت کے انھوں نے ہمیشہ دلّی کے لوگوں میں میل جول رکھنے کی کوشش کی حالانکہ نہ ان کو کوئی پارلیمنٹ یا اسمبلی کی ممبری درکار تھی۔ نہ وزارت کی کرسی اس زمانہ کے ہندو مسلمان بلاتفریق مذہب و ملت حکیم صاحب کے اشاروں پر چلتے تھے۔ اس لئے انگریز حکام بھی ان سے مرعوب تھے اور ان کو دلّی کا بے تاج بادشاہ کہا جاتا تھا۔"

نور الدین احمد چیئرمین طبیہ کالج نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ میں بقول پنڈت سندر لال جی کے ایسا ہی مسلمان ہوں کہ مذہبی تفریق روا نہیں رکھتا۔ غالباً یہ دلّی کی اس خوش گوار فضا کا اثر ہے جس میں میں نے آنکھ کھولی اور جس کے آخری نمائندے حکیم اجمل خاں تھے۔ اب تو تعصب کے روحانی مرض میں پورا ملک اس بری طرح مبتلا ہو گیا ہے کہ کوئی علاج کارگر ہوتا نظر نہیں آتا۔ مگر میرے لڑکپن میں ایسا نہیں تھا۔ ہوا سال عمر تک دلّی کے رہنے والوں میں میں نے کہیں کوئی تفریق نہیں دیکھی۔ ہولی، بسنت، دیوالی

سہرہ، پھول والوں کی سیر دلّی کے ہندو مسلمان مل کر مناتے تھے اور موسم کی خوش گواری
ابو رالطف اٹھاتے تھے۔ محرم میں دلّی کے ہندو بھی سبیلیں رکھتے اور اپنے بچوں کو سبز
بنے پہناتے اور تعزیوں کے جلوس میں پورے احترام سے شرکت کرتے تھے۔

"انگریزوں نے بہت پہلے ہندو مسلمان میں تفریق کرنے کی کوشش شروع کر دی
تھی لیکن باہمی ملاپ کی بنیاد ایسی استوار تھی کہ پورے ڈیڑھ دو سو سال تک یہ لوگ
کوشش کرتے رہے تب کہیں جا کر پہلی جنگ عظیم کے بعد جھگڑے شروع ہوئے۔ اس دور
میں حکیم صاحب کو یاد کرنے کی ضرورت اس لئے ہم اور بھی سمجھتے ہیں کہ وہ ہمارے باہمی میل
ملاپ کی آخری نشانی تھے۔ ورنہ اس سے قبل ہر ہندوستانی ایسا ہی ہوتا تھا جیسے کہ وہ
تھے۔ گاندھی جی کا یہ مقولہ تھا کہ ہندو مسلمان ہندوستان کے جسم کے دو ہاتھ ہیں۔ اگر
ان میں سے ایک ہاتھ بھی کام نہیں کرتا تو قوم مفلوج ہو جاتی ہے اور اب صورتِ حالات
کچھ ایسی ہی ہو رہی ہے۔"

آخر میں جنرل سکریٹری نے مقررین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ "حکیم اجمل خاں صاحب
جیسا کہ سب دلّی والے جانتے ہی ہیں، صرف اچھے طبیب اور اونچے درجے کے رہنما ہی نہیں
بلند پایہ ادیب اور خوش گو شاعر بھی تھے۔ اردو تو ان کے گھر کی لونڈی تھی۔ فارسی اور عربی
میں بھی وہ شعر کہتے تھے اور شیدا تخلص کرتے تھے۔ ان کے دیوان خانے میں دلّی کے نامی
گرامی شعراء اور ادباء کا مجمع لگا رہتا تھا، اور مریضوں کے دیکھنے کے بعد ان کے وقت کا کافی
حصہ علمی ادبی مشاغل میں گذرتا تھا۔ مجھے خوشی ہے کہ آج انجمن ترقی اردو کی جانب سے ایک
ایسے انسان کی یاد میں نشست کی گئی ہے جو بہ یک وقت نامور طبیب، قومی لیڈر، اور
بلند پایہ شاعر و ادیب تھا۔"

انجمن ترقی اردو اور اردو کے مسائل

(انجمن کی شاخ دہلی کی مخصوص نشست)

انجمن ترقی اردو کی ایک مخصوص نشست ۲۱ر جنوری ۱۹۶۲ء کی شام کو جناب

آل احمد سرور صاحب کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ اس میں ممبران انجمن کے علاوہ دلی کے
سربرآوردہ ادیب و شاعر بھی موجود تھے۔ نشست میں انجمن ترقی اردو اور اردو کے مسائل پر
کھل کر گفتگو کی گئی اور اردو کی ترقی میں اس دور میں جو چیزیں حائل ہیں ان پر غور کیا گیا۔ نشست
کا آغاز کرتے ہوئے حمیدہ سلطان نے کہا کہ مرکزی انجمن یا انجمن کی شاخ دہلی کے متعلق یہاں یہ
کہا جاتا ہے کہ دلی میں اردو کے مسئلے کے متعلق وہ اب تک کچھ نہیں کر سکی ہے۔ سرور صاحب
سے میں درخواست کرتی ہوں کہ مرکزی انجمن کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے اس مسئلے پر
روشنی ڈالیں۔

سرور صاحب نے فرمایا کہ اردو کی ترقی کا سوال ایک قومی مسئلہ ہے کیوں کہ ہندوستان
کی چودہ منظور شدہ زبانوں میں سے ایک زبان اردو بھی ہے۔ انجمن کی تحریک چند واضح خطوط
پر چلتی رہی ہے۔ انجمن ہرگز ہندی کی مخالفت کرنا نہیں چاہتی لیکن یہ بھی نہیں چاہتی کہ اردو کے
حقوق اس کو نہ ملیں۔ اس کا حق منوانے کے لئے ہمارا دوسری زبان والوں سے رابطہ رکھنا بھی
بے حد ضروری ہے اور ہم یہ بھی نہیں چاہتے کہ اردو کا حق مانگنے والے کسی سیاسی پارٹی سے
محض اس کا حق منوانے کے لئے خود کو وابستہ کرلیں۔ یہ تو ایک قومی مسئلہ ہے۔ اس لئے اس کو کسی
سیاسی پارٹی کا کھلونا نہیں بنایا جا سکتا۔ بہت سی سیاسی پارٹیاں اردو کے حق کو مانتی ہیں۔ اور
آئے دن ان پارٹیوں کے لیڈر اردو کی تعریف کرتے رہتے ہیں لیکن جہاں تک عمل کا سوال ہے،
وہاں صرف ایک پارٹی کے عمل کو دیکھنے کا موقع ملا ہے اور مجھے افسوس ہے کہ اس پارٹی کے قول
فعل میں تضاد بھی ہے۔

اردو کی کوئی تحریک قومی وحدت میں خلل نہیں ڈالتی بلکہ اردو تو ہمارے مخلوط کلچر کی مستقل
نشانی ہے۔ ان چودہ سالوں میں ملک میں بہت تبدیلیاں ہوئی ہیں اور اب چند فرقہ پرست
جماعتوں کے سوا اکثریت کا رجحان جمہوری ہے۔ اس سے ہمیں بڑی خوشی ہے کہ اردو زبان کے ساتھ
وہ تعصب اب نہیں برتا جاتا جو ۵۰ء میں تھا۔ اردو کے نامور لکھنے والوں کو دوسری زبانوں کے
بڑے ادیبوں کی طرح شہرت ملتی ہے اور یہ اطمینان بخش بات ہے۔ [illegible] اتر پردیش، بہار، پنجاب
اور دلی کی زبان ہونے کے علاوہ ہندوستان گیر زبان ہے لیکن اس کی بھی [illegible] کہیں کی علاقائی

بان نہیں ملا گیا۔ یہ صورت حال اس کی ترقی میں حائل ہے۔ انجمن ترقی اردو کی تقریباً سَو
ا خیں ہیں، بیشتر شاخوں نے بہت مفید کام کئے ہیں۔ دلی شاخ بھی کام کرنے میں کسی سے
یچھے نہیں ہے۔ اردو کو علاقائی زبان منوانے کے لئے برابر کوشش کر رہی ہے اور مرکزی انجمن
بھی کوشش ہے کہ جلد از جلد یہ مسئلہ حل ہو جائے لیکن اس مسئلے میں بعض ایسی رکاوٹیں ہیں کہ
کام ابھی تک نہیں ہو سکا لیکن یہ سمجھ لینا غلط ہے کہ ہم لوگ کچھ بھی نہیں کر رہے ہیں اور یہ سمجھنا
ور بھی غلط ہے کہ سب کچھ ہم نے کر لیا ہے۔ اردو تحریک میں وہ سب خامیاں ہیں جو ہندوستان
ا دو تحریکوں میں ہیں اور اس کے علاوہ ایک بڑی خامی یہ ہے کہ اردو والوں نے اپنے اوپر
عتماد کرنا نہیں سیکھا۔ خود اعتمادی کا جذبہ اگر ہم میں نہیں ہوگا تو اس سے ہمارے مقصد کو
قصان ہوگا۔ ہندی کی ترقی سے میں سمجھتا ہوں اردو کے لئے کام کرنے کا میدان اور وسیع ہوگا۔
ہیں دوسروں پر اعتراض کرنے کے بجائے اپنی خامیوں کو بھی دیکھنا چاہیئے۔ صرف حکومت کے
تائید پر نظر رکھنے یا انجمن پر نکتہ چینی کرتے رہنے سے اردو کی ترقی نہیں ہو سکتی۔ چاہئے تو یہ کہ
ہر اردو والا بطور خود جتنا بھی کام کر سکتا ہے کرے۔

جگن ناتھ آزاد نے کہا کہ انجمن کے پروگرام کے بارے میں سرور صاحب نے بہت تفصیل سے
بات کی ہے لیکن ہم محسوس کرتے ہیں کہ روز بروز اردو جاننے والوں کا حلقہ محدود ہوتا جا رہا ہے
اور یہ بہت خطرناک بات ہے۔ ہمیں چاہیئے کہ اپنے اپنے حلقے میں اردو پڑھانے کا انتظام کریں
جس سے اردو کی ترقی ہوگی اور ہم سے احساسِ کمتری بھی دور ہوگا۔ انجمن تو اپنے انداز سے
کام کرتی ہے لیکن اردو پڑھانے کا انتظام بطور خود کرنا ہر اردو دوست کا فرض ہے۔

رشید حسن خاں نے کہا کہ ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ انجمن زیادہ ادبی ہے یا زیادہ عوامی۔
یوپی میں دستخطی مہم کے بعد انجمن سے عوام کا رابطہ ایک طرح ٹوٹ سا گیا ہے اور یہ خلا دن بہ دن بڑھتا
ہی جاتا ہے۔ انجمن کی اکثر شاخیں ادبی نشستیں اور مشاعرے کر کے سمجھتی ہیں کہ انھوں نے اردو
کی ترقی کے لئے کافی کام کر لیا۔ مرکزی انجمن کو خاص اس طرف نظر رکھنا چاہیئے۔ بہت سی شاخوں کا مرکز
سے تعلق برائے نام سا ہے۔ انجمن نے اپنی سرگرمیوں کا دائرہ اتنی اونچی سطح پر رکھا ہے کہ شاخیں بالکل
اس سے ناواقف ہیں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ مرکزی انجمن انتخاب کے علاوہ ان تحفظات کی طرف

نظر کرے جس کا بڑا حصہ خود اس کے کتب خانے میں ہے۔ کتابیں تو انجمن سے ہر سال شائع ہو کر نکلتی ہیں لیکن اس میں کلاسیکل کتابوں کا حصہ برائے نام ہے حالانکہ ضرورت اس کی ہے کہ انجمن کلاسکی ادب زیادہ شائع کرے۔

رشید حسن خاں نے کہا کہ املا کے لئے انجمن مسلمہ اصول وضع کرے۔ تقسیم وطن سے پہلے ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صاحب کی صدارت میں جو کمیٹی بنائی گئی تھی، اس نے املا کے جو اصول وضع کئے تھے، انجمن نے چار سال تک ان کی پابندی کی۔ اب ان اصولوں کو پیش نظر نہیں رکھا جاتا۔

قمر شوری پرنسپل فتحپوری اسکول نے کہا کہ ہمارے اسکول میں ذریعہ تعلیم اُردو ہے۔ ہم یہ دقت محسوس کر رہے ہیں کہ بورڈ نے نئی کتابیں اردو میں تیار نہیں کرائیں۔ دلّی اسٹیٹ کے محکمہ تعلیم سے ہم نے کہا لیکن محکمہ کا کہنا ہے کہ ہندی سے اردو میں ترجمہ کرنے کے لئے کتابیں دی جاتی ہیں۔ اردو والے اس طرف توجہ نہیں کرتے۔ نہ پبلشر اس طرف غور کرتے ہیں۔ جب ہمارے یہاں سے اردو ذریعہ تعلیم میں پاس ہو کر لڑکے نکلتے ہیں تو یونیورسٹیوں میں انھیں بڑی مشکل ہوتی ہے۔ وہ ہندی کی کتابوں کو سمجھ نہیں سکتے۔ دلّی کے دوسرے اسکولوں میں اُردو کے معیار کو نہیں بڑھایا جاتا۔ حالانکہ یہ محسوس کیا جاتا ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ اردو ماسٹر نہیں ملتے۔ پچھلے دو سال سے ہم اپنے اسکول کی جانب سے ریڈیو پر اردو کے پروگرام پیش کرتے ہیں لیکن سمجھنے والوں میں ہندی ذریعہ تعلیم کے بچے ہوتے ہیں۔ ہمیں اس سلسلے میں دوسرے اسکولوں سے تعاون نہیں ملتا۔

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے کہا کہ اس میں شک نہیں کہ انجمن ترقی اردو جس انداز سے کام کر رہی ہے وہ عوامی بھی ہے اور ادبی بھی لیکن یہ عام طور پر محسوس کیا جاتا ہے کہ عوام سے انجمن کا تعلق برائے نام ہے اور یہ اس کی ترقی میں حارج ہے۔ اردو کی ہندوستان گیر حیثیت یہ چاہتی ہے کہ کام کی رفتار اور تیز کی جائے۔ مرکز کا شاخوں سے واسطہ ایسا رہے کہ ہر شاخ کی نقل و حرکت پر مرکز کی نظر ہو اور مرکز کے کاموں کی مختصر تفصیل ہر شاخ کو معلوم ہو۔ بہتر یہ ہے کہ اب مرکزی انجمن کا علی گڑھ سے دلّی میں منتقل کیا جائے۔ جب دفتر علی گڑھ بھیجا گیا تھا وہ حالات معمولی نہیں تھے۔ اب اردو تحریک

کا کام دلّی سے شروع ہو تو زیادہ جلدی کامیابی ہوگی۔ اس لئے کہ یہ راجدھانی ہے اور اردو کی جنم بھومی ہے۔ مطبوعات کے سلسلے میں ڈاکٹر نارنگ نے کہا ببلیو گرافی چالیس برس پہلے حیدرآباد سے شائع ہوئی تھی۔ انجمن نے اس سلسلے میں پھر کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ قاضی عبدالغفار صاحب مرحوم نے ایک فہرست تیار کرائی تھی وہ مسودے کی شکل میں موجود ہے۔ اس کی تصحیح کرا کے شائع کرایا جاسکتا ہے اور تحقیقی ادب کی طرف مرکزی انجمن کو زیادہ توجہ دینی چاہئے۔ نیز اردو ادب کی اشاعت بھی وقت پر ہو اس کے معیار کو بلند کرنے کی بھی ضرورت ہے۔ غالب کی سو سالہ برسی کا پروگرام کس صورت میں مرکزی انجمن پیش کرے گی اس کا بھی ابھی سے ایک پروجکٹ بنانا چاہئے۔

اجمل خاں صاحب نے فرمایا کہ اردو کا رسم الخط ایسا ہے کہ اردو کے طالب علموں کے لئے اس سے بڑی دشواریاں ہوتی ہیں۔ اس سلسلے میں انجمن نے جو اصلاحی کمیٹی مقرر کی تھی اس نے رپورٹ بھی پیش کی لیکن اس پر عمل نہیں ہوا۔ اردو کی جتنی اصطلاحات بن رہی ہیں حکومت نے اسے شائع کیا ہے ان کا ترجمہ نہایت ناقص ہے اگر اردو کا کوئی ادیب اس پر نظر ڈالے تو اسے صاف نظر آئے گا مرکزی انجمن کو اس پر غور کرنا چاہئے۔ میں نے چودہ زبانوں کے الفاظ جمع کئے اسے گورنمنٹ نے شائع بھی کیا ہے۔ بنگالی، اڑیا، فارسی کے کافی لفظ موجود ہیں۔ انجمن ان الفاظ کی جو اردو کے ہیں اور دوسری زبانوں میں شامل ہیں ڈکشنری بنوائے۔ ہندی اور اردو والے مل کر بیٹھیں تو یہ کام آسانی سے ہوسکتا ہے کہ بنیادی ہندی بنائیں۔ اردو کی ترقی کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ رومن رسم الخط میں انجمن شعروادب کا انتخاب شائع کرے۔

رشید علوی صاحب نے کہا کہ دستخطی مہم کا نتیجہ ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا اس سے ایک مایوسی کی فضا اردو والوں میں پیدا ہو گئی ہے۔

ڈاکٹر قمر رئیس نے کہا کہ اجمل خاں کے فرمانے کے مطابق اصطلاحات پر توجہ کرنا ضروری ہے لسانی فارمولے پر بھی انجمن کو غور کرنا چاہئے۔ میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اس سے اردو کو فائدہ نہیں ہوا جب غیر قومی حکومت کے زمانے میں ثانوی درجہ میں اردو کو لازمی رکھا گیا تو پھر اپنی قومی حکومت میں یہ کیوں نہیں ہو سکتا۔ انجمن جہاں اور چیزوں کو نظر کے سامنے رکھتی ہے وہاں اس پر بھی غور کرے پہلے انجمن نے سائنس اور معاشیات کے نام سے رسالے نکالے تھے۔ انجمن کو اس طرف بھی توجہ دینی

چاہئے لیکن چونکہ اراکین انجمن کے سامنے اس وقت اردو کے تحفظ کا سوال ہے اس وجہ سے علمی ادبی کام نہیں ہو پاتے جب صورت حالات اطمینان بخش ہوگی تو پہلے کی طرح انجمن کام کرے گی۔

سرور صاحب نے فرمایا مجھے خوشی ہے کہ آپ سب لوگوں نے بڑے خلوص سے انجمن کو مشورہ دیا اور اپنے دلی خیالات کا اظہار کیا میں نے جیسا کہ پہلے عرض کیا تھا اس وقت میں انجمن کے سامنے کچھ مشکلات رہی ہیں کہ جن کی وجہ سے کام ٹھیک ڈھنگ سے نہیں ہو پایا ہے۔ ہمارے کاموں میں جو رکاوٹیں درپیش ہیں ان سے اردو دوست واقف نہیں اس لئے اعتراض کرتے ہیں لیکن مجھے اس سے بڑی خوشی ہوئی کہ اب اردو والے تعمیری تنقید کو اپنا رہے ہیں اور تحقیقی پہلوؤں کی طرف زیادہ غور کر رہے ہیں۔

رسم الخط کے بارے میں سرور صاحب نے فرمایا کہ ہم نے ۵۶ء میں ایک سلسلہ جاری کیا تھا جس میں تمام مشاہیر علم و ادب کی رائے معلوم کی تھی ان میں مولانا آزاد صاحب بھی شامل تھے لیکن اردو رسم الخط قدامت پسند واقع ہوا ہے۔ مولانا سمیت اکثریت کی رائے یہی تھی کہ موجودہ رسم الخط میں کسی بڑی تبدیلی یا اصلاح کی ضرورت نہیں۔

انجمن کے ادبی اور عوامی کاموں کی حد بندی بہت دشوار ہے لیکن یہ یقین رکھئے کہ اردو دوستوں کی تجاویز کو ہم نظر انداز نہیں کر سکتے۔

مرکزی انجمن کو دلی منتقل کرنے کی درخواست کے جواب میں سرور صاحب نے فرمایا کہ علی گڑھ نے انجمن ترقی اردو کے لئے جو کام کیا اور جس دور میں کیا وہ یہاں ان حالات میں ہونا ممکن نہ تھا علی گڑھ نے انجمن ترقی اردو کو جتنا کچھ دیا ہے اردو والوں کو اس پر فخر کرنا چاہئے لیکن اب ہماری مجلس عاملہ فیصلہ کر چکی ہے کہ دفتر کو دلی آجانا چاہئے اس کے لئے جو اقدامات کئے جا رہے ہیں اس میں کچھ وقت لگے گا مگر یہ فیصلہ ہو چکا ہے کہ عمارت کے لئے مناسب زمین ملنے اور عمارت بننے پر انجمن دلی [illegible]

سرور صاحب نے دلی شاخ کو ہدایت کی کہ وہ جلد از جلد اعداد و شمار مہیا کرے کہ ابتدائی [illegible] مدرسوں، ثانوی اسکولوں میں پڑھنے والوں کی تعداد کتنی ہے تاکہ کوئی اقدام دلی میں اردو کے مسئلہ پر کیا [illegible]

مستقل تنظیم کے لئے سرور صاحب نے فرمایا کہ وہ اپنی جگہ کامیاب تھی اس کا کوئی ایک کیا [illegible] تنظیم نہ ہونا اس میں انجمن کا قصور نہیں۔ یہ سماجی نظام کی خرابی ہے۔ اب اردو کے بہی خواہوں کو چاہئے کہ [illegible]

اپنے حلقوں میں وہ اپنے ہم نوا بنائیں اور اگر ضرورت ہو تو وہ سامنے آکر ہمارے ساتھ اردو کے لئے کام کریں جب تک اردو والے خود پر اعتماد نہیں کریں گے صرف انجمن کی کوشش سے کچھ نہ ہو سکے گا۔ آپ اپنی ریاستی شاخ کو مفید مشورے دیجئے اور اپنے اخلاص عمل سے اس کے کارکنوں کے ہاتھ مضبوط بنائیے۔

آخر میں پنڈت سندر لال صاحب صدر شاخ دلی نے فرمایا۔

سرور صاحب کے ہم بے حد مشکور ہیں کہ انھوں نے باوجود بے حد مصروفیت کے ہمیں اتنا وقت دیا۔ ہماری باتیں سنیں اور اپنے خیالات سے ہمیں مستفید فرمایا۔ مجھے اردو دوستوں سے یہ کہنا ہے کہ اس وقت انجمن ترقی اردو کے حالات بالکل ایسے ہی ہیں جیسے کہ جنگ کے زمانے میں کسی ملک کے ہو جاتے ہیں۔ اراکین انجمن کا بہت سا وقت بے کار دوڑ دھوپ، ہنگامی کاموں، حکومت اور افسران متعلقہ سے گفتگو کرنے میں صرف ہو جاتا ہے۔ اس لئے اونچے درجے کا علمی تحقیقی کام نہیں ہو پاتا۔ جیسے ہی صورت حالات ٹھیک ہوگی انجمن پہلے کی طرح کام کرے گی۔ یہ تو ہم جانتے ہیں کہ اس دور میں کام کرنا کتنا مشکل ہے۔ ہاں مرکزی انجمن کو عوام سے قریب کرنے کے لئے رابطہ قائم کرنا سمجھتا ہوں ہمارے لئے ضروری ہے۔

دہلی کارپوریشن سے مطالبہ

جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو شاخ دلی نے ۱۴؍ اکتوبر کو ایک خط میئر کارپوریشن کو لکھا تھا جس میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ الیکشن کے لئے جو لٹریچر چھاپا جائے وہ اردو میں بھی ہونا چاہیئے جس کے جواب میں الیکشن افسر نے مطلع کیا کہ ووٹر سلپیں اور لٹریچر اردو میں بھی چھپوایا گیا ہے۔ جنرل سکریٹری نے ایک اور خط لکھا ہے جس میں مطالبہ کیا گیا ہے کہ جا نون کو دعوت نامے اردو میں بھی بھیجے جانے چاہئیں کیونکہ دلی کی علاقائی زبان اردو ہے۔ آئندہ بھیجے جانے والے دعوت ناموں میں اردو کو بھی شامل کیا جائے۔ ایک اور خط میں بجٹ میمو ہندی کے ساتھ ساتھ اردو میں چھاپنے کے لئے کہا گیا ہے۔

یوم غالب

انجمن ترقی اُردو کی شاخ دہلی کی جانب سے ۱۵ار فروری سنہ ۱۹۶۲ء کو مزار غالب پر یوم غالب منایا گیا۔ ممبران انجمن کے علاوہ مقامی شاعروں، ادیبوں، اخبار نویسوں اور معززین شہر نے اس بزم میں شرکت کی۔ صدارت کے فرائض ڈاکٹر تاراچند صاحب ممبر راجیہ سبھا نے انجام دئے۔

ڈاکٹر تاراچند کا خطبۂ صدارت

غالب کا زمانہ ایک عجیب زمانہ تھا۔ سنہ ۱۸۵۶ء میں دلّی کی ناگفتہ بہ حالت تھی اور ۱۸۵۷ء میں وہ عظیم انقلاب ہوا جس نے ہندوستان کو ایک طویل عرصے کے لئے غلام بنادیا۔ لیکن مرزا غالب کی شہرت ان کی وفات کے بعد دن بدن زیادہ ہوتی گئی اور آج جب کہ دنیا بڑی تیزی سے بدل رہی ہے غالب کے فن کی آب و تاب جوں کی توں ہے اور ان کے کلام کو قبول عام کا درجہ حاصل ہے۔ حالانکہ اس پر فارسی کا اثر زیادہ ہے۔ فارسی غالب کے زمانہ میں حکومت کی زبان تھی۔ وہ نسلاً تورانی تھے اور ان کے آباء و اجداد کی زبان فارسی تھی اس لئے ان کی اُردو شاعری کی بنیاد بھی فارسی تراکیب پر ہے اور ان کے ابتدائی دَور کے اُردو کلام میں تو فارسیت بہت زیادہ ہے۔ جو ادیب جس زمانہ میں ہوتا ہے وہ اس زمانے کے تقاضوں کا مقابلہ کرتا ہے۔ غالب کے ساتھ بھی یہی صورت پیش آئی۔ انھوں نے وہ شہنشاہی دور بھی دیکھا جب اُردو ادب کی حیثیت درباری تھی لیکن اُردو کے متعلق جو یہ کہا جاتا ہے کہ وہ بادشاہوں کی منظورِ نظر رہی اور درباری محلوں میں پلی بڑھی صحیح نہیں ہے۔ زوال سلطنت تیموریہ تک سرکاری زبان فارسی تھی۔ بڑے لوگ اُردو کو زیادہ منہ نہیں لگاتے تھے۔ اس زمانہ میں تمام خط و کتابت پڑھے لکھے اصحاب فارسی میں کرتے تھے۔ لشکر کے لوگ، بازارو اور نچلے طبقے کے

کام چیشتر مُردہ بولتے تھے۔ غالب نے اُردو خطوط نگاری کی سب سے پہلے طرح ڈالی۔ اس طرح اپنی نثر میں وہ عوام سے بہت قریب آ گئے۔

اس ملک کا مزاج ایسا ہے کہ یہاں ہمیشہ دو زبانیں رہی ہیں۔ جب سنسکرت سرکاری زبان تھی تو پراکرت کو عوام میں مقبولیت حاصل تھی اور جب حکومت کی زبان فارسی تھی تو آپس میں میل جول قائم کرنے کے لئے اور لین دین کے واسطے عوام نے ایسی زبان بنائی جس میں فارسی بھی شامل تھی، سنسکرت بھی اور ترکی بھی تھی عربی بھی۔ اس کی نیو برج بھاشا اور کھڑی بولی پر رکھی گئی۔ چونکہ اس کی ابتدا لشکر میں ہوئی تھی اس لئے اس کو اُردو کا نام دیا گیا۔

غالب نے پہلے اُردو میں کچھ عرصے تک شعر کہے پھر ان کا رجحان فارسی کی طرف ہو گیا۔ آخری دَور کا اُن کا اُردو کلام بہت صاف اور سلیس زبان میں ہے۔ اور جیسا کہ میں نے پہلے کہا خطوط نگاری میں غالب کا اپنا انفرادی رنگ ہے۔ غالب کا اُردو پر بہت بڑا احسان ہے کہ انھوں نے اُردو کو وہ تاب و توانائی اپنی نظم و نثر سے بخشی کہ اُردو بھی ترقی یافتہ زبانوں سے آنکھ ملانے کے لائق ہو گئی۔ نقادوں نے کہا ہے کہ غالب کا زمانہ یاسیت اور قنوطیت کا زمانہ ہے۔ چوں کہ اس دور میں ہندوستان پر ادبار و نکبت کی گھٹائیں چھائی تھیں اور افراتفری کا عالم تھا۔ اسی لئے غالب کی شاعری پر حزینہ کیفیت چھائی ہوئی ہے۔ لیکن ان کی فطری شوخی اور طبعی شگفتگی نے اس کے کلام کو نوحہ نہیں بننے دیا۔

میری ناچیز رائے میں اگر کوئی زبان ہر تقاضا کو پورا کر سکتی ہے تو وہ غالب کی زبان ہے۔ لوگ کہتے ہیں اُردو کی کیا ضرورت ہے۔ ہندی والوں کے لئے بھی دو زبانیں ہیں۔ ایک سرکاری اور دوسری غیر سرکاری۔ پندرہ برس میں کسی سماج کی کایا پلٹ نہیں ہو سکتی۔ ہندی والوں کی یہ زبردستی کہ اُردو کا نام و نشان مٹا دیا جائے بہت بڑی غلطی ہے۔ ہم لوگوں کو سوچ کر یہ فیصلہ کرنا ہے کہ ہماری کیا زبان ہوگی۔ اسی زبان کو تو ہم اپنائیں گے جو ہم بولتے ہیں۔ ناموں سے کیا ہوتا ہے چیز کو

دیکھنا چاہیئے۔ غالب نے بھی اُردو کو ہندی کا نام دیا ہے۔ اُردو کے لئے تو یہ
اچھا ہے کہ وہ ہمیشہ کی طرح عوامی زبان رہے۔ حکومت کے بوجھ سے بچی رہے۔
ہماری اُردو زبان صوفیوں، درویشوں، فن کاروں اور عوام کی زبان ہے۔ اس لئے
اس کو ہر دلعزیزی کا وہ درجہ حاصل ہے اور اس کے مقابلے میں ہندوستان کی کوئی زبان
نہیں آ سکتی۔ اس زمانہ میں بھی ہماری سرکاری زبان ہندی ہے تو اُردو قومی زبان ہے
ہاں یہ ضرور ہے کہ اُردو بولنے والے اس کو زیادہ سے زیادہ عوامی رنگ دیں۔
زندہ زبانیں صرف دعویٰ کرنے سے نہیں بنتیں ان میں تو آئے دن تبدیلیاں ہوتی
رہتی ہیں اور اُردو میں تو اخذ کرنے کی بہت قوت ہے۔ ہر زبان کا لفظ اس زبان میں
اگر انگوٹھی میں نگینے کی طرح بیٹھ جاتا ہے۔ میں نے حیدر آباد میں اُردو کانفرنس کے
موقع پر دیکھا کہ اُردو کے لئے وہاں لوگوں کے دلوں میں کتنی محبت ہے۔ آندھرا صوبہ
کے بہت سے لوگ کانفرنس میں شریک تھے۔ وہاں تقریریں بھی ہوئیں اور شعر بھی
پڑھے گئے۔ وہاں کے مقامی اثرات اُردو نے لئے ہیں اسی لئے جہاں بھی اُردو
بولی جاتی ہے اس جگہ کے مزاج کے مطابق ہو جاتی ہے۔ یہ بات ہندوستان میں
ہی نہیں بلکہ باہر کے ملکوں میں بھی ہے۔ ایران میں جو زبان آج کل لکھی جا رہی
ہے وہ بالکل عوامی ہے اور ہم لوگ جنھوں نے پرانی فارسی پڑھی ہے اس
زبان کو سمجھ نہیں پاتے۔ اُردو عوام کی زبان ہے۔ میں زبان کو ایک ذریعہ سمجھتا
ہوں کام کرنے کا۔ ماحول کے مطابق زبانوں میں بھی تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔
اُردو زبان کے علاوہ اور کسی زبان میں ایسا زور نہیں جو دلوں پر اس طرح اثر انداز ہو۔ ہندی
ہو یا اُردو دونوں زبانوں کے لکھنے والوں سے میری درخواست ہے کہ وہ کوشش کریں
کہ ان کی لکھی ہوئی چیزیں عوام سمجھ سکیں۔ ہندی کی بھی حالت یہ ہے کہ میں ہندی دان
ہونے کے باوجود اچھیسا کی اکثر رپورٹیں سمجھ نہیں سکتا۔ غالب کو آخر میں یہ
خراج عقیدت پیش کرتا ہوں ان جیسا فن کار ہندوستان میں پیدا ہوا
یہ اس ملک کی خوش نصیبی ہے ورنہ غالب نے اپنے فن کی بدولت شہرت دوام

کا خلعت حاصل کیا اور ان کی شاعرانہ عظمت اس وقت پوری دنیا پر چھائی ہوئی ہے۔ بیرونی ممالک کے اکثر لوگ اپنی ملکی زبانوں میں ان کے کلام کا ترجمہ کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر تاراچند صاحب کے فاضلانہ خطبۂ صدارت کے بعد گوپی ناتھ صاحب امن، اور رشید حسن خاں صاحب نے غالب کی زندگی اور ان کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ اس کے بعد سلام مچھلی شہری نے اپنی نئی نظم "غالب" پیش کی۔

روشن صدیقی، طالب دہلوی، محسن زیدی اور سمت پرکاش نے غالب کی طرح میں غزلیں پڑھیں۔

آخر میں مشہور فن کار نصیر خاں صاحب نے غالب کی دو غزلیں گا کر پیش کیں۔

یوم آزاد

۱۲ مارچ کی شام کو دہلی پبلک لائبریری میں انجمن ترقی اُردو شاخ دہلی کی جانب سے حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے ایک جلسہ منعقد ہوا۔ صدارت کے فرائض لالہ شام ناتھ میئر دلی کارپوریشن نے ادا کئے۔ لالہ جی نے اپنی صدارتی تقریر میں فرمایا کہ مولانا نے ملک و قوم کی جو خدمت کی وہ ہندوستان کی تاریخ میں سُنہرے حروف سے لکھی جائے گی۔ ہمارے ملک کی تاریخ میں ان کا ثانی تو مشکل سے ملے گا۔ وہ انڈین نیشنل کانگریس کے صدر ۳۳ یا ۳۴ سال کی عمر میں منتخب ہوئے اور اس وقت کانگریس قدم قدم پر انگریزی سامراج سے ٹکر لے رہی تھی انھوں نے اس خوش اسلوبی سے کام کیا اور ایسے استقلال کا ثبوت دیا جس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ مجھے شرف نیاز مندی سات یا آٹھ سال اُن سے حاصل رہا۔ جب بھی کوئی پیچیدہ مسئلہ دلی کے لئے درپیش ہوا، میں ان کی خدمت میں حاضر ہوتا اور وہ اپنے ناخن تدبیر سے

منٹوں میں اُلجھے ہوئے معاملات کو سلجھا دیتے تھے۔ مولانا انسانی نفسیات کے بہت بڑے نبّاض اور انسان شناس تھے۔ ان کی نظر میں بڑی گہرائی اور وسعت تھی۔ حضرت مولانا کو یاد کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ہم ان کے اصولوں کو اپنائیں۔ وہ عمر بھر قومی ایکتا کے لئے کام کرتے رہے اور مرتے دم تک اس کی کوشش میں رہی کہ تعصب کا بُرا مرض ہندوستان سے دور ہو جائے۔ مجھے افسوس ہے کہ ہم اپنے ملک کے اچھے لوگوں کے گُن تو گاتے ہیں اور ان کی یاد میں جلسے بھی کرتے ہیں، لیکن ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش نہیں کرتے۔ ہمارا ملک سینکڑوں سال کی غلامی کے بعد آزاد ہوا ہے۔ چھوٹے چھوٹے معاملوں میں پڑ کر یا ذات پات اور زبان نسل کے قصّوں میں اُلجھ کر بڑے کام ہم بالکل نہیں کر سکتے۔ یہ صورتِ حالات افسوس ناک ہے۔ اگر ہمیں حضرت مولانا کے ساتھ دلی عقیدت ہے تو آئیے ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کریں اسی میں ہی اپنا، قوم کا اور ملک کا بھلا ہے۔

پنڈت سندر لال صاحب نے اپنے پُرانے رفیق کو یاد کرتے ہوئے رقت آمیز لہجے میں فرمایا کہ مولانا بہت بلند درجے کے مسلمان تھے بظاہر وہ ایسے نظر نہیں آتے تھے لیکن وہ وسیع المشرب، صوفی منش اور سچے مومن تھے۔ مولانا کی وفات سے ملک و قوم کو بڑا نقصان پہنچا ہے۔ اب پنڈت نہرو کو ان کی طرح مشورہ دینے والا کوئی نہیں رہا۔ مولانا میں یہ عادت بہت اچھی تھی کہ گاندھی جی کی طرح وہ اپنی غلطیاں مان لیا کرتے تھے۔

آسن صاحب نے فرمایا کہ مولانا آزاد کی علمیت و قابلیت کے متعلق کچھ عرض کرنا سورج کو چراغ دکھانا ہے۔ وہ جتنے بڑے انسان تھے اتنے ہی بڑے صحافی، ادیب، خطیب اور عالم بھی تھے۔ سیاست کا تو وقار ہی ان کے دم قدم سے تھا۔ مولانا کو ایک ایسے پہاڑ سے تشبیہ دی جا سکتی ہے جس سے ٹکراتے ہوئے طوفانِ حوادث گزر جائیں اور اس کو جنبش نہ ہو

جہاں تک ان کی خطابت کا تعلق ہے بقول ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب "مولانا موتی بھی رولتے تھے اور انگارے بھی"

ظفر پیامی صاحب نے اپنی تقریر میں اس کی شکایت کی کہ ہم نئی نسل کے لوگوں کو مولانا آزاد کے متعلق بہت کم مواد ملتا ہے۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ مولانا کے مضامین اور ان کی تصانیف کی معقول اشاعت کا جلد سے جلد اہتمام کیا جائے۔

جن شعرائے مولانا آزاد کو خراج عقیدت پیش کیا ان میں تلوک چند محروم، روش صدیقی اور جگن ناتھ آزاد کے نام قابل ذکر ہیں۔

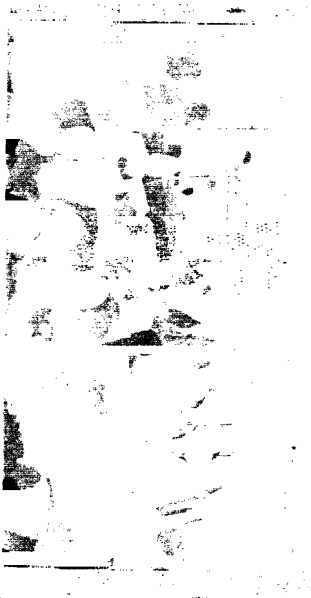
تلوک چند محروم کو خراج عقیدت

انجمن ترقی اُردو شاخ دلّی کے زیر اہتمام ۸ اپریل کی شام کو عالی جناب احمد محی الدین صاحب ڈپٹی منسٹر سول ایو ی ایشن کی صدارت میں ایک جلسہ منعقد ہوا، اس جلسہ میں جناب پروفیسر تلوک چند محروم صاحب کی ادبی خدمات پر جو حکومت پنجاب نے اعزاز دیا ہے اس پر اظہار مسرت کیا گیا، صدر شاخ دلی پنڈت سندر لال صاحب نے جلسے کا آغاز کرتے ہوئے فرمایا میں محروم صاحب کی دل سے قدر کرتا ہوں۔ وہ صاف دل، وسیع النظر اور پاکیزہ فطرت انسان ہیں جن پر ہندوستان فخر کرسکتا ہے۔ وہ ہماری شاخ کے نائب صدر ہیں اس لئے ہم گورنمنٹ پنجاب کے ممنون ہیں کہ محروم صاحب کی گراں قدر خدمات کی قدردانی کرکے گورنمنٹ پنجاب نے انجمن ترقی اُردو کو ممنون کیا۔ محروم صاحب نے اپنی تمام عمر اُردو کی خدمت اور قومی اتحاد کے لئے کام کرنے میں گذاری ہے۔ ان کے کام اتنے زیادہ ہیں کہ ان کی تعریف تھوڑے لفظوں میں کرنا دریا کو کوزے میں بند کرنا ہے۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں ان کے ساتھ کام کرکے ہماری عزّت و وقعت زیادہ ہوئی ہے۔

اس وقت وہ یہاں تشریف لائے اور اپنی شرکت سے ہمیں عزت بخشی یہ ان کا بہت بڑا کمال ہے۔ پنجاب گورنمنٹ نے بھی ان کی خدمات کی قدر کرکے اپنے وقار کو بڑھایا ہے۔

غلام احمد فرقت صاحب اور رشید حسن صاحب نے مقالے پڑھے۔ حمیدہ سلطان نے محروم صاحب کے پاکیزہ کردار اور اعلیٰ انسانیت پر مختصر سی تحریری تقریر پیش کی، ہیرالال فلک نے دو قطعات پیش کیے۔ روش صدیقی صاحب نے محروم صاحب کے شاعرانہ بلند کردار اور انسان دوستی پر ان کو خراج عقیدت پیش کیا اور صدر محترم نے صدارتی تقریر میں فرمایا:

"محروم صاحب کے ادبی کاموں کے متعلق تو میں کچھ عرض نہیں کرسکتا لیکن میں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ جب میں علی گڑھ کالج میں میٹرک کا طالب علم تھا انقلاب کی نظموں میں اور میرے ساتھی ڈھونڈھ نکالتے تو ان نظموں میں کافی نظمیں محروم صاحب کی ہوتی تھیں۔ ہم لوگ ان نظموں کو پڑھ کر نیا ولولہ پاتے تھے اور قومی کام کرنے کی ہمت ہم میں زیادہ ہوتی تھی۔ محروم صاحب نے نوجوانوں سے لے کر اس وقت تک ہر عالم میں ملک کی خدمت کی۔ ان کی تصانیف سے بوڑھے جوان اور بچے یکساں استفادہ کرسکتے ہیں۔ میرے لئے یہ امر باعث مسرت و اعزاز ہے کہ مجھے اس جلسے کا صدر بنا کر عزت بخشی گئی اس طرح مجھے اظہار مسرت کا اس مبارک تقریب پر موقع مل گیا۔" آخر میں محروم صاحب نے اپنا کلام سنایا۔



ضمیمہ

سلام مچھلی شہری

میرزا غالبؔ

(یومِ غالب کے موقع پر پڑھی گئی)

"قطب" کی محفلِ تخئیل کی اک ماہ پارہ تھی
جو موجِ رنگ و نکہت، نورِ نغمہ تھی، شرارہ تھی
مگر گھبرا بھی جاتی تھی خود اپنے خوابِ رنگیں سے
ابھی کم سن تھی اور واقف نہ تھی آدابِ تزئیں سے

زمانہ گزرا، اور اُس جبیں پر بھی شباب آیا
یہی دن تھے کہ فنِّ شاعری میں انقلاب آیا
دیارِ تاج سے اک شاعرِ اعظم ہوا پیدا
سراپا شعلۂ گل، نغمہ و شبنم ہوا پیدا
قطب کی محفلِ تخئیل میں اک روشنی آئی
نگارِ نازاب آئینے میں لیتی تھی انگڑائی

نمبر ۲

چراغِ سرد اس کے حُسن کے پرتو سے جل اُٹھا
وہ عالم تھا کہ خود شاہِ جہاں گویا مچل اُٹھا

اُدھر شاعر جوانی اور جوانی کی بہاروں میں
خود اپنی عظمتِ افکار کے نازک شراروں میں
نکھر کر ایک دیوتا بن گیا تھا شعر و نغمہ کا
"مگر اک عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ تھا"
بس اب 'بزمِ قطب' بزمِ دلّی کی ماہ پارہ تھی
جو اس کی جنّتِ افکار کا رنگیں نظارہ تھی

بہر صورت وہ اب دلّی کی محفل کا ستارا تھا
یہ مانا اپنی ہی پروازِ فکر و فن سے ہارا تھا
مگر خوشبو اُسی کی گلستاں محلوں میں رہتی تھی
اُسی کی نَے ظفرؔ کی دُکھ بھری غزلوں میں بستی تھی

کہا ہے گفتگو سے پہلے مہ پارہ جسے میں نے
وہ اب الھڑ نہ تھی، واقف تھی ہر آدابِ محفل سے

ضمیمہ

نکل کر محفلِ گل، تنگ آ کر شورِ بلبل سے
ضیائے فکر و دانش لے کے غالبؔ کے تخیل سے
اُبھر سکتی تھی نورِ کہکشاں و ماہ و اختر سے
وہ اب آنکھیں ملا سکتی تھی مہرِ جل اور ہوتر سے
غرض، اُس نو بہارِ ناز کو "اردو زباں" کہیے
وطن کی مشترک تہذیب کا روشن نشاں کہیے
جو ہر فن کار سے آرائشِ محفل کا طالب تھا
خدائے شعر و نغمہ کی قسم وہ صرف "غالبؔ" تھا
وہ غالبؔ جس نے اردو شاعری کو روشنی بخشی
ضیائے علم و دانش دے کے تازہ روشنی بخشی
وہ جس نے بربطِ ہندی پہ نغماتِ عجم گایا
وہ جو حافظؔ کو بھی فردوسِ خسروؔ کے قریں لایا
وہ غالبؔ حُسن کا رِ زُہرۂ اردو جسے کہیے
گلستانِ ادب میں جانِ رنگ و بو جسے کہیے

ہزاروں شاعرانِ نکتہ رس دلّی میں رہتے ہیں
بہ فیضِ یادِ غالبؔ ہم بھی یوں اشعار کہتے ہیں

رنگ محل

حمیدہ سلطان کا تاریخی اور ادبی شاہکار

حمیدہ سلطان جنرل سکریٹری انجمن ترقی اُردو (ہند) شاخ دلّی
کا ناول رنگ محل چھپ گیا ہے یہ ناول ادبی اور تاریخی لحاظ سے
ایک خاص مرتبہ کا ناول ہے۔ بعید از قیاس تصوریت اور گندی
جنسی شعریت اس میں کہیں بھی نظر نہیں آتی۔ اور جو زبان اس میں
استعمال کی گئی ہے وہ نمایاں طور پر دوسرے ناولوں سے اس کو
ممتاز کرتی ہے۔

رنگ محل کے طرز بیان میں روانی، زبان میں شگفتگی
ہے زبان کی بے ساختگی اور مکالمے میں شائستگی اور لوچ
نے اس کو پڑھنے کی چیز بنا دیا ہے۔ اس کو پڑھ کر دلّی کی
مٹی ہوئی تہذیب کا نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔
اونچے گھرانوں کی معاشرت معلوم ہو جاتی ہے اور اس ناول
کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے جو دلّی کے گھر والوں میں نہیں بلکہ
گھرانوں میں بولے جاتے تھے محاورات میں اظہار کرتے ہیں

قیمت: چھ روپے

ملنے کا پتہ: علی منزل کوچہ پنڈت، دلّی

962

Vol. 1,

SUBH

AN URDU QUARTERLY JOURNAL

Editor

M. ATIQ SIDDIQI

Published by

ANJUMAN TARRAQI-I-URDU DELHI BRANCH

DELHI-6